مسلم لیگ

قائد اعظم

صدر ایوب

اور

مولانا مودودی

جائزہ ——— احتساب ——— محاکمہ

از

سید رئیس احمد جعفری ندوی

طبع اوّل

۱۹۶۵ء

مطبوعہ

اشرف پریس لاہور

قیمت 32½

روپے

فہرست

ایک سوال !!!

۱	انتساب	۹
۲	حرفِ آغاز	۱۵
۳	مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی	۱۹
۴	مطالعہ اور تعارف	۲۳
۵	اسلام	۲۹
۶	اسلام اور مسلمان : ایک طنز	۳۱
۷	مسلم لیگ۔ پاکستان اور سبک سارانِ ساحل	۷۱

۸ - تنظیم ملی کا جرم

قصور ڈھونڈ کے پیدا کیے جفا کے لیے ۷۳

۹ - قائداعظم

قومیت، ملیت، اسلامیت ۱۰۱

۱۰ - قیادتِ عظمیٰ

نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں ۱۱۲

۱۱ - الفاظ کا جادو

ایک دل چسپ تکنیک: مغالطہ ۱۲۹

۱۲ - اسلام کس کا ہے؟

صرف چند لوگوں کا یا سب کا، اسلام کی اجارہ داری ۱۳۷

۱۳ - صدر ایوب اور مولانا مودودی ۱۴۵

۱۴ - آزردگیٔ غیر سبب ۱۴۷

۱۵ - نظر بازگشت ۱۵۹

۱۶ - ایک بے انتہا اہم سوال ۱۶۱

۱۷ - قائداعظم اور پاکستان ۱۶۷

۱۸ - قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی تو نہیں رکھتا ۱۶۹

۱۹ - اسلام اور جمہوریت ۱۷۱

۲۰ - مسلمان اور ہندو کا فرق ۱۷۲

۲۱ - پیامِ عید ۱۷۴

۲۲ - اسلام کی عالی حوصلگی اقلیتوں سے ۱۷۸

۲۳ - اسلام اور ہندومت میں کوئی اشتراک نہیں ۱۷۹

۲۴ - مغربی جمہوریت غیر اسلامی ہے ۱۸۱

۲۵ - مسلمان کی انفرادیت ۱۸۳

۲۶ - مولانا مودودی جواب دیں ۱۸۴

۲۷ - حلف نامہ

جس پر قائد اعظم نے بھی دستخط کیے ۱۸۶

۲۸ - حلف نامہ ۱۸۷

۲۹ - ہم سچے مسلمان ہیں ۱۸۹

۳۰ - پاکستان اور عالم اسلام ۱۹۱

۳۱ - ہمارے رسولؐ کا اسوۂ حسنہ ۱۹۳

۳۲ - پاکستان میں اسلام کی حکومت ہوگی ۱۹۴

۳۳ - ہم اسلامی جمہوریت قائم کریں گے ۱۹۵

۳۴ - ہم اسلامی جمہوریت کی پاسبانی کریں گے ۱۹۶

۳۵ - اسلامی سوشلزم ۱۹۸

انتساب

جماعت اسلامی کے اُن حقیقت پسندوں کے نام

جو جماعت سے الگ ہو گئے

ایک اہم سوال؟

مولانا ظفر الملک علوی مدیر "الناظر" بڑے بیباک قومی کارکن تھے۔ وہ اردو کے بلند پایہ رسالہ "الناظر" کے مدیر شہیر ہی نہیں تھے۔ قوم اور ملک اور مذہب کی خاطر بار بار جیل بھی گئے تھے۔ وہ مرحوم مہاراجہ محمود آباد کے سخت مخالف تھے۔ اور پبلک جلسوں میں ان کے خلاف بے دھڑک تلخ الفاظ استعمال کیا کرتے تھے۔ مہاراجہ یوپی کے ہوم ممبر اور سر ہارٹ کورٹ بٹلر گورنر کے گہرے دوست تھے، انہوں نے مولانا کو کئی سال کے لیے جیل بھیج دیا،

کئی سال کے بعد مولانا جب جیل سے رہا ہوئے تو مہاراجہ کی ہوم ممبری ختم ہو چکی تھی۔ بٹلر جا چکا تھا، مہاراجہ صرف ایک معزز شہری تھے، رہائی کے بعد مولانا ظفر الملک نے "الناظر" کا جو پہلا پرچہ نکالا اس کے پہلے مضمون کا عنوان تھا،

"مہاراجہ محمود آباد سے معذرت!"

اس مضمون میں مولانا نے لکھا تھا کہ جیل کی تنہائی میں انہوں نے اپنا جائزہ لیا۔ اپنی تقریروں اور تحریروں کو پرکھا، تو محسوس کیا کہ کئی بار وہ مہاراجہ کے ساتھ حد سے

اختلاف سے گذر کر زیادتی کے مرتکب ہوئے تھے، جس پر وہ پشیمان ہیں، ——

اور طالبِ عفو!

اس تحریر کا اثر یہ ہوا کہ گو بقیہ زندگی میں بھی دونوں کے فکری اور سیاسی اختلافات قائم رہے، لیکن دونوں —— بالخصوص —— مہاراجہ ایک دوسرے کا احترام کرنے لگے۔

کیا مولانا مودودی، قائدِ اعظم، قائدِ ملت، صدر ایوب، پاکستان اور مسلم لیگ سے متعلق جو کچھ فرما چکے ہیں۔ اس پر نظرِ ثانی کر کے اپنا جائزہ لے کر، اعلانِ خطاء کی اخلاقی جرأت رکھتے ہیں؟

سخن ہائے گفتنی

○ حرفِ آغاز

○ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی

○ مطالعہ اور تعارف!

حرفِ آغاز

مولانا مودودی ایک انسان ہیں، ان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ فکر و نظر کی بھی، اور قول و عمل کی بھی، اور ان غلطیوں کی نشان دہی اگر اخلاص کے ساتھ کی جائے تو یہ بھی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ شاید میں اس خدمت کی طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن دو باتیں ایسی ہیں جنہوں نے مجھے اس کام پر آمادہ کیا۔

ایک تو یہ کہ خود جماعتِ اسلامی کے کارفرما متعدد مرتبہ اخبارات میں اعلان و تشہیر کر کے لوگوں کو دعوت دے چکے ہیں کہ وہ مولانا کی اور جماعت اسلامی کے اساطین کی تحریروں کا مطالعہ کر کے خود سے کوئی رائے قائم کریں، ان لوگوں کے بیانات سے گمراہ نہ ہوں جنہوں نے سیاق و سباق سے الگ کر کے اور توڑ مروڑ کے مولانا کی تحریروں کو غلط رنگ پہنایا ہے۔

مجھے اس بات میں بھی معقولیت نظر آئی،

چنانچہ میں نے مولانا کی تحریروں کا بامعانِ نظر مطالعہ کیا، اس کے بعد ایک

رائے قائم کی، اور وہی رائے اب میں پیش کر رہا ہوں،

دوسرے نوٹ میرے ذہن میں بھی یہ خیال آیا کہ سارے پاکستان میں یہی ایک جماعت ہے جو اسلام کا نام لے کر، اور اسلام کی داعی بن کر اور حکومت الہیہ کا پرچم ہاتھ میں لے کر میدان میں اتری ہے۔ دوسری سیاسی جماعتیں ہیں، اور ان میں بڑی تعداد ایسی جماعتوں کی ہے جو اسلام کا نام تو لیتی ہیں لیکن یہ نام ان کی حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں برنارڈ شا نے مسٹر چرچل پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مسٹر چرچل کی زبان پر جمہوریت کا لفظ چڑھا ہوا ہے لیکن یہ لفظ ان کی حلق سے نیچے نہیں اترتا!"

جماعت اسلامی پر اس طنز کا دہرانا مقصود نہیں ہے۔ لیکن یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ جماعت نے اسلام کا نام ضرورت سے زیادہ استعمال کیا۔ لیکن اس طرح کہ فائدہ نہ جماعت کو پہونچا نہ اسلام کو، نہ مسلمانوں کو۔

اس ملک میں "اسلامی انقلاب" رونما ہو چکا ہوتا اگر اس جماعت سے ہمالیہ جیسی عظیم الشان غلطیاں سرزد نہ ہوئی ہوتیں۔ اور ان غلطیوں پر اس نے اصرار نہ کیا ہوتا، بڑائی اس میں نہیں ہے کہ آدمی غلطی کرے اور اس پر چٹان کی طرح جم جائے۔ بڑائی اس میں ہے کہ انسان سے اگر غلطی سرزد ہو جائے تو بے تامل اس کا اعتراف کرلے اور آئندہ کے لیے، اس سے مجتنب ہو جائے۔

ایک انسان کی حیثیت سے ہم غلطی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہماری تحریک خدا کے لیے ہے، ہماری دعوت خدا کے لیے ہے، ہمارا جوشِ عمل، جذبۂ کردار اور زورِ گفتار خدا، اور صرف خدا کے لیے ہے تو پوری سچائی اور دیانت کے ساتھ ہمیں اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ غلطی کا یہ اعتراف تحریک اور جماعت کی تقویت

کا سبب ہو گا، اس کی کمزوری اور انحطاط کا باعث نہیں بن سکتا۔

مولانا مودودی، اور ان کے رفقاء کار کی سب سے بڑی غلطیاں جو ان کی کامیابی کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو رہی ہیں، حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تحریک پاکستان سے علیحدگی، اس کی مخالفت، اور اس کے بارے میں حقارت اور طنز سے بھرپور لب و لہجہ۔

۲۔ قائدِ اعظم کی ذات، شخصیت، کردار، اور سیرت پر بے دردانہ اور مبنی بر تصورات مزعومات نکتہ چینی، اور اس سلسلے میں حد درجہ نازیبا اور ناقابلِ برداشت الفاظ کا استعمال۔

۳۔ عام مسلمانوں کو "پیدائشی" اور "نسلی" مسلمان کا طعنہ دینا، اس طنز میں تحقیر، تمسخر اور انانیت کے جملہ عناصر کا پوری شدت کے ساتھ بے محابا استعمال۔

۴۔ اپنے لیے "حق" کی اجارہ داری پر اصرار، اور دوسروں کو اس سے محروم رکھنے پر اصرار۔

۵۔ اپنے اور صرف اپنے لیے دیانت فکر کے "جملہ حقوق محفوظ" کر لینے کا بے پناہ جذبہ، اور دوسروں کے لیے اس حق کا یکسر انکار۔

۶۔ کشمیر کے سلسلے میں متنازعہ فتویٰ۔

۷۔ استدلال کے مغالطے۔

۸۔ مخالفوں کے لیے ناملائم اور ناسزا الفاظ کا بکثرت استعمال ــــ وغیرہ وغیرہ۔

اگر مولانا آج بھی ان غلطیوں کا اعتراف کر لیں اور اعلان کر دیں تو ان کی دعوت جنگل کی آگ کی طرح پھیل سکتی ہے، تلافی مافات ہر وقت ہو سکتی ہے۔ اب بھی ممکن ہے۔ اگر مولانا تلافی پر آمادہ ہو جائیں تو میرا اعتقاد ہے۔ تاریخ جماعت اسلامی کا رخ بدل سکتا ہے۔

مجھ میں اگر یہ جرأت نہیں ہے کہ خلق خدا کے خلاف کوئی مورچہ قائم کروں تو الحمدللہ اتنی اخلاقی جرأت بھی ہے کہ خدا کی خفگی مول لے کر، کسی کو خوش کرنے کی کوشش نہ کروں۔ میں نے آئندہ اوراق میں جو کچھ لکھا ہے، وہ میرے دل کی آواز ہے، اور اسی لیے میرا ضمیر مطمئن ہے!"

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی

ادیبوں کا مجمع ہو یا سیاست دانوں کی محفل، دانش وروں کی انجمن ہو، یا اصحاب فکر و نظر کا دائرہ، علماء کی جماعت ہو یا صوفیاء کی مجلس، حکومت کا ایوان ہو، یا اربابِ صحافت کا شبستان، پڑھے لکھے لوگوں کا حلقہ ہو یا نیم خواندہ اور جاہل لوگوں کا اڈا۔ مزدوروں کی سبھا ہو یا سرمایہ داروں کا قصر "من فضل ربی"! کاشتکاروں اور زمینداروں کی چوپال ہو یا جاگیرداروں اور وڈیروں کی بزم پُر تکلف، مسجد ہو یا خانقاہ ہر جگہ اور ہر کہیں بس ایک موضوع ہے جو بکثرت زیرِ بحث آتا رہتا ہے۔ یہ موضوع ہی وقت کا اہم ترین مسئلہ بن گیا ہے اور یہ مسئلہ ہے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے افکار و عقاید، خیالات، نظریات اور کردار و گفتار سے متعلق مداحانہ و مخالفانہ اظہارِ خیال۔

یہ نقد و تبصرہ مدح و قدح دونوں پر مشتمل ہے، کچھ لوگ ہیں جو مولانا اور ان کی جماعت کے افکار و معتقدات کو "وحی یوحیٰ" سمجھ رہے ہیں، دوسری طرف

نقادوں اور نکتہ چینوں کا گروہ ہے جو اس جماعت کے خیر کو بھی شر کے رنگ میں پیش کر رہا ہے۔ ایک طرف افراط ہے دوسری جانب تفریط، کہیں غلو ہے کہیں انتہا پسندی، کہیں ادعا ہے، پندار ہے، انانیت ہے ـــــ اور اس ادعا، پندار اور انانیت میں جو چیز کرمک شب تاب کی طرح چمکتی ہے وہ ہے "نحن ابناء اللہ"[1] کی ذہنیت، کہیں طنز ہے، تعریض ہے، حرف گیری ہے، تحقیر ہے اور یہ طنز و تعریض اور حرف گیری و تحقیر جس چیز کی آئینہ دار ہے، وہ ہے مخالفین کے بارے میں عدم رواداری، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

لا یجرمنکم شنان قوم، ان لا تعدلوا، اعدلوا، ھو اقرب للتقوٰی[2]

اخباروں میں اس موضوع سے متعلق مراسلات و مقالات، اور بیانات میری نظر سے برابر گزرتے رہے ہیں، میں خود بھی مولانا اور ان کی جماعت کی رفتار و گفتار کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ مدح و قدح کے اس طوفان نے مجھے اکسایا کہ اس سلسلے میں اپنے معلومات کا دائرہ زیادہ وسیع کرنے اور کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لیے، جس حد تک بھی ممکن ہو سکے، جماعتی لٹریچر کا مطالعہ کر دں، میں نے ایسا کیا، آئندہ اوراق کا مواد میرے اسی مطالعے کا نتیجہ ہے :

میں نے جو کچھ لکھا ہے، دیانت فکر کے ساتھ لکھا ہے۔ میرے دل میں مولانا مودودی کا احترام ہے۔ انھوں نے جس استقلال و عزیمت کے ساتھ اپنا مشن جاری رکھا ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ظلم ہے کھٹن سے کھٹن دور میں بھی انھوں

---

[1] ہم خدا کے بیٹے ہیں "قرآن کریم"

[2] کسی قوم یا (جماعت) کی دشمنی تمھیں حدودِ عدل سے متجاوز نہ کر دے (بہیئت) عدل سے کام لو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے!"

نے جس جرأت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور اختلاف، ہنگامہ آرائی اور طوفان سے بے نیاز ہو کر جس طرح اپنے مسلک پر قائم رہے وہ ان کے مخلص ہونے کی بہت بڑی، بلکہ سب سے بڑی دلیل ہے۔

لیکن استقلال و عزیمت اور اخلاص و ایثار کے صفات عالیہ سے متصف ہونے کے باوجود کوئی شخص نہ معصوم قرار دیا جا سکتا ہے، نہ کمزوریوں اور لغزشوں سے ماوراء تصور کیا جا سکتا ہے، اس کے اقوال و افعال، سیرت و کردار، اور رفتار و گفتار کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے اور احتساب بھی کیا جا سکتا ہے، اس کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے، اور اس کی لغزشوں پر ٹوکا بھی جا سکتا ہے۔

روک دو گر غلط کہے کوئی

ٹوک دو گر غلط چلے کوئی!

لیکن جائزے اور احتساب کے کچھ آداب و حدود ہیں، اور میں کوشش کروں گا کہ ان آداب کو مدِ نظر رکھوں، اور ان حدود سے تجاوز نہ کروں۔ ذاتیات کو زیرِ بحث لانا اور شخصی زندگی پر نکتہ چینی کرنا، غلط اصول ہے۔ اپنے معروضات کے سلسلے میں میری سختی کے ساتھ یہ کوشش ہوگی کہ اس پہلو سے اجتناب کروں، دیکھنا یہ چاہیے، کہنے والا کیا کہتا ہے؟ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ کہنے والا کون ہے؟[1] میں نے خیالات پر جرح و تعدیل کی ہے۔ ذاتیات و شخصیات پر نہیں۔ میرا خیال ہے اگر، قومی، سیاسی، اور مذہبی مسائل پر بحث و گفتگو کے وقت یہ اصول پیشِ نظر رکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں اور تلخیاں جو خواہ مخواہ پیدا ہو جاتی ہیں، خود بخود دور ہو جائیں گی۔

---

[1] انظر الی ما قال، لا تنظر الی من قال، ——— یہ دیکھو کہنے والے نے کیا کہا ہے؟ یہ نہ دیکھو کہنے والا ہے کون؟

اور ان کی تخلیق کا سلسلہ یک قلم منقطع ہو جائے گا۔"

میں نے سب سے پہلے، چند عنوانات کے ماتحت جماعت اور امیر جماعت کے اقوال و ارشادات کو پرکھا ہے اور ان پر ایک طالب علمانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ آخری باب "مظر بازگشت" کا ہے جس میں اپنے مطالعے اور تحقیق کی بنا پر میں نے بتایا ہے کہ جماعت اپنے مقصد میں کامیاب ہے یا ناکام؟ اگر یہ کامیاب ہے تو کامیابی کے شواہد کیا ہیں؟ اور ناکام ہے تو ناکامی کے اسباب و علل کیا ہیں؟

اصل بحث شروع کرنے سے پہلے "مطالعہ اور تعارف" کا عنوان ملے گا جس میں جماعت کی دعوت، اس دعوت کی اہمیت، حیثیت اور نوعیت و کیفیت پر گفتگو کی گئی ہے کہ بغیر اس کے اصل مباحث تشنہ رہیں گے!

مطالعہ اور تعارف!

کوئی جماعت جب میدانِ عمل میں آتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے، اس کی نوعیت اور حیثیت کیا ہے؟ اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اس کی دعوت کا اصول اور منہاج کیا ہے؟ اس کے مضمرات و عوائد کیا ہیں؟ اس کی منزلِ مقصود کیا ہے؟

ساتھ ہی ساتھ یہ سوال بھی زیرِ غور آتا ہے کہ آیا یہ جماعت سیاسی ہے یا مذہبی؟ اس کا دائرۂ کار صرف معاشی اور اقتصادی امور تک محدود ہے یا اس کی دعوت ان حدود سے ماوراء ہے؟

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس نظام اور آئین کو یہ اپنی قوم اور ملک میں فروغ دینا چاہتی ہے وہ بجائے خود کیا ہے؟

یہ تمام سوالات جماعت اسلامی کے بارے میں بھی پیدا ہوتے ہیں۔

جماعت کے لٹریچر، اس کے امیر کے ارشادات و بیانات، اس کے ہمدردوں، کارکنوں اور حامیوں کی تحریروں اور تقریروں کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو ماننا پڑے گا

یہ جماعت خالص طور پر نہ سیاسی ہے، نہ مذہبی، نہ طبقاتی۔ البتہ اس کی ہیئت ترکیبی میں یہ تینوں عناصر شامل ہیں۔ یعنی بیک وقت یہ سیاسی بھی ہے، مذہبی بھی اور طبقاتی بھی ہے۔

سیاسی یوں کہ سیاست یا بہ الفاظ دیگر سعی حصول اقتدار میں اس نے اتنا زیادہ غلو کیا کہ متعدد ایسے اصحاب جو اس جماعت کے رکن رکین تھے جنہوں نے اس کی تاسیس و تشکیل میں نمایاں حصہ لیا تھا اور جنہوں نے اس کے قیام و بقا کے لیے بڑے سے بڑے ایثار اور قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا۔ اس کی سیاست پسندی اور جذبۂ اقتدار سے نالاں، بد دل اور مایوس و بیزار ہو کر الگ ہو گئے۔ الگ ہونے والے حضرات کی مذہبیت اس کی متقاضی تھی کہ جماعت صرف اصلاح و تطہیر کے فرائض انجام دے، لیکن جماعت کے اکابر اس مقدس فریضے کو کچھ بہت زیادہ درخور اعتناء نہیں خیال کرتے تھے، وہ حکومت اور اقتدار کو اپنی کامیابی کی شرط اول قرار دیتے تھے۔

یہ بنیادی اختلاف تھا، اور بنیادی اختلاف میں سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ نہیں ہوا، خالص مذہبی اصلاح کا علم بردار گروہ الگ ہو گیا اور وہ لوگ باقی رہ گئے۔ جو عنانِ اقتدار ہاتھ میں لے کر اصلاح و تطہیر کا فریضہ انجام دینا چاہتے تھے۔

اس جماعت کو مذہبی یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی دعوت کا آغاز دین کے نام سے ہوا تھا، دین ہی کے نام پر یہ اقتدار و اختیار کی مالک بننا چاہتی ہے۔ مسندِ افتا اور تختِ حکومت دونوں پر تصرف قائم رکھنے پر یہ بضد ہے، گویا،

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق!

جام شریعت اور سندانِ عشق کے امتزاج و اختلاط سے جو مرکب تیار ہو سکتا ہے وہ جماعتِ اسلامی ہے۔

اس جماعت کو طبقاتی بھی کہا جا سکتا ہے۔ جو لوگ کمیونزم کے داعی ہیں سوشلزم کا پرچار کرتے ہیں، اقتصادی مساوات اور مساوی تقسیم دولت کے مبلغ اور منادہیں، وہ گویا ایک مخصوص طبقے کو ابھارنا اور بڑھانا چاہتے ہیں۔ جماعت اسلامی کمیونزم کی مخالف ہے۔ سوشلزم سے اسے کوئی واسطہ نہیں، لیکن ملکیت فرد کے تحفظ اور استحکام و بقا کے معاملے میں اس درجہ سنجیدہ ہے کہ جاگیرداری کو اس بیسویں صدی میں نہ صرف جائز، درست اور صواب قرار دیتی ہے، بلکہ اس کی تائید اور نصرت میں بھی پیش پیش ہے۔ طبقاتیت صرف یہی نہیں ہے کہ غریبوں کو ابھارا جائے اور دولت مندوں کو دبایا جائے ..... یعنی

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو!
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو!!
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!
گرماؤ غریبوں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو!

بلکہ طبقاتیت یہ بھی ہے کہ غریبوں کو دبایا جائے اور امیروں کو ابھارا جائے۔ اگر کوئی جماعت سرمایہ داری اور جاگیرداری کو مذہبی اور دینی طور پر جائز اور برحق تصور کرتی ہے تو خواہ وہ سیاسی اور مذہبی نہ ہو لیکن طبقاتی ضرور ہے۔

دانش مندوں کا قول ہے کہ بیک وقت دو کشتیوں پر پاؤں رکھنا قرین فہم نہیں ہے۔ لیکن یہاں تو ایسے بھی موجود ہیں جو بیک وقت تین کشتیوں میں پاؤں رکھے اور ساحل مراد تک صحیح سلامت پہنچ جانے کی توقع رکھتے ہیں، نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تجربہ

دلچسپ ہے۔

کسی دعوت یا تحریک کی کامیابی کے لیے، ایک لازمی امر یہ بھی ہے کہ وہ دو ٹوک ہو، واضح ہو، اس میں کسی طرح کا ابہام نہ ہو، اضطراب فکر نہ ہو، اینچ پیچ نہ ہو، جو دعوت یا تحریک جتنی زیادہ صاف، بے لاگ، سیدھی اور واضح ہوگی، اتنی ہی زیادہ کامیاب ہوگی، جو جماعت یا تحریک عوام کے دل پر دستک دینے کی صلاحیت رکھتی ہے "قبول خاطر لطف سخن خداداد است" کے ذیل میں آجاتی ہے، وہ سیل رواں کی طرح بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے۔

اس کے برعکس جو جماعت یا تحریک قلوب عوام کی دھڑکن سے دور ہوگی ممکن ہے کچھ دماغوں کو وہ اپیل کر سکے۔ لیکن اس میں یہ استعداد و صلاحیت نہیں پیدا ہو سکتی کہ ایک طوفان بلاخیز بن جائے اور جو طاقت اس کے راستے میں حائل ہو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے۔

جماعت اسلامی اپنی دعوت، مقصد اور منہاج کے اعتبار سے اب تک ا[illegible] عام فہم نہیں بن سکی ہے کہ قلوب عوام کی دھڑکن بن سکے، اس نے کچھ دماغوں کو ا[illegible] ساتھ ضرور ملا لیا ہے لیکن تسخیر قلوب عوام میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکی ہے جب تک یہ صورت احوال قائم ہے اس کی دعوت محدود رہے گی۔ اس میں وسعت اور گیرائی نہیں پیدا ہو سکتی۔ ایک عوامی تحریک اگر وسعت اور گیرائی سے محروم ہے اس کی حیثیت نقش بر آب سے زیادہ نہیں، وہ صرف ایک ذہنی اور علمی تحریک بن سکتی ہے۔ عملی اور عوامی تحریک نہیں بن سکتی، معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدی اور اسی قبیل کی دوسری جماعتیں ذہنی اور علمی تحریکیں تھیں۔ حکومت وقت کی سرپرستی اور تائید کے باوجود عملی اور عوامی تحریکیں نہیں بن سکیں۔

بالکل یہی کیفیت ہمیں جماعت اسلامی کی بھی نظر آتی ہے، اس جماعت

عالم وجود میں آئے ہوئے ۲۵ سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی ہے لیکن آلودۂ سیاست ہونے کے باوجود اب تک یہ مرکزی یا صوبائی مجلس آئین ساز میں حزب مخالف بنانے کی طاقت بھی نہیں پیدا کر سکی۔

اس کے برعکس مسلم لیگ نے صرف گیارہ سال کی مختصر سی مدت میں ایک نیا ملک بنا دیا، ——— ایک نیا ملک جو دنیا کی اسلامی حکومتوں میں سب سے بڑا اور دنیا کے بڑے ملکوں میں پانچواں نمبر رکھتا ہے۔

ذرا غور فرمائیے:۔

کانگرس نے اپنے قیام کے تقریباً ساٹھ سال بعد ہندوستان کو آزاد کرانے میں کامیابی حاصل کی، جب کہ اس کے ساتھ ہندوستان کی تمام قومیں تھیں سرمایہ داروں کا بہت بڑا طبقہ تھا، اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب شامل تھے۔ مسلمانوں کی بھی ایک بڑی جماعت اس میں شریک تھی!

لیکن مسلم لیگ؟

بار بار مری ——— زندہ ہوئی!

۱۹۳۵ء میں قائداعظم نے لندن سے واپس آکر اس کا احیاء کیا۔

۱۹۳۶ء میں یہ مسلمانانِ ہند کی سب سے زیادہ فعال اور کارگزار جماعت بن گئی۔

۱۹۳۷ء میں اس نے ایک پروگرام وضع کیا، اپنی قوم کے سامنے رکھا، اور قوم نے اس پر مہرِ تصدیق ثبت دی،

۱۹۴۰ء میں اس نے اپنی منزلِ مقصود "پاکستان" کو قرار دیا، اور مسلمانانِ ہند کی "واحد نمائندہ جماعت" ہونے کا بجا دعویٰ کیا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان حاصل کر لیا،

اس کے برعکس ربع صدی کی مدت میں جماعت اسلامی ایک دن کے لیے بھی عوامی جماعت نہ بن سکی،

کیا یہ کوئی معمولی فرق ہے۔

اس سے مطالعہ اور تعارف کے بعد قلم کا مسافر اب آگے بڑھتا ہے!

اسلام

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

اسلام اور مسلمان: ایک طنز

مسلماں جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا!
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا!

جماعت اسلامی کا سب سے زیادہ کمزور پہلو یہ ہے کہ گو وہ "اسلامی" ہے، لیکن مسلمانوں کے ایمان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے، بلکہ ان کے ایمان پر، ان کے اسلام پر، ان کے مسلمان ہونے پر، ان کے جذبۂ اسلامی پر بے دردی کے ساتھ طنز کرتی ہے، انہیں "نسلی" اور "پیدائشی" مسلمان کے نام سے اس طرح یاد کرتی ہے گویا یہ بہت بڑی گالی ہے۔

جس طرح احساسِ کمتری ایک مرض ہے، اس طرح احساسِ برتری بھی ایک مرض ہے اور شاید پہلے سے زیادہ سنگین اور مہلک، اور یہ جماعت اس مرض میں

بری طرح مبتلا ہے، صرف اپنے آپ کو مسلمان سمجھنا، اور دوسروں کے اسلام پر طنز کرنا ان کے دعوے اسلام کو حقارت سے دیکھنا، ان کی اسلامیت کا مذاق اڑانا، یہ شائستگی کا آئین ہے، نہ اسلام کا اصول۔

جماعت جن مسلمانوں کو حقارت کے ساتھ "پیدائشی مسلمان" کہتی ہے اور جن کے اسلام کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے، یہ کیسے مسلمان ہیں؟

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کے لیے ہمیشہ سرفروشی کے مظاہرے کیے ہیں، اسلام کی حرمت پر گردنیں کٹائی ہیں، اسلام کے دفاع اور حفظ و بقا کے لیے خاک و خون میں لتھڑے ہیں، اسلام نے جس قربانی، جس فدویت اور جس ایثار کا مطالبہ کیا، انہوں نے بسر و چشم اس مطالبے کو قبول کیا۔

بے شک یہ "پیدائشی مسلمان" "مفسر قرآن" نہیں ہیں، انہوں نے "تفہیم القرآن" کا علم بلند کیا ہے، نہ "ترجمان القرآن" ہونے کے مدعی ہیں۔ یہ نہ مفسر ہیں نہ محدث نہ فقیہ، نہ متکلم، لیکن کیا اسلام کے لیے مر مٹنا اسلام کی حرمت پر قربان ہو جانا، مسلمانی اسلام ہے؟

"پیدائشی مسلمان" کا لفظہ (یا گالی) دینے والے لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ خود اسلام کا اس باب میں طرز عمل کیا ہے؟ خود اسلام نے اور داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس باب میں کیا اصول مقرر کیا، اور کیا اسوہ چھوڑا ہے؟

حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے۔

من قال لا الٰہ الا اللہ فدخل الجنۃ[1]

پھر کلمہ لا الٰہ پڑھنے والوں کو پیدائشی مسلمان قرار دے کر اسلام کی صف سے

---

[1] جس نے صدق دل سے کلمہ لا الٰہ پڑھ لیا وہ جنتی ہے،

خارج کر دینا کون سا اسلامی اصول ہے ؟ لوگوں کو مسلمان بنانا زیادہ مستحسن ہے یا اسلام سے خارج کر دینا۔

تو برائے وصل کردن آمدی،

نے برائے فصل کردن آمدی!

ایک جنگ میں عین اس وقت جب سیف اللہ خالد بن ولید کی تلوار قضا کے مبرم بن کر دشمنوں اور کافروں کی گردن کاٹ رہی تھی، ایک کافر زد میں آیا اور فوراً اس نے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیا، لیکن حضرت خالد کی شمشیر بے اماں اس کی گردن کاٹ چکی تھی۔

یہ واقعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں لایا گیا تو آپ نے پوچھا!
"تم نے ایسا کیوں کیا؟"
جواب میں عرض کیا:-
"اس لیے کہ اس نے جان بچانے کے لیے قبولِ اسلام کا اظہار کیا تھا"
آپ نے خشمگیں نگاہوں سے خالد بن ولید کو دیکھا اور فرمایا:-
"هل شققت قلبه؟" [1]
اور اس کے بعد ایک سے زائد بار دستِ مبارک آسمان کی طرف بلند کر کے کہا:-
"بارالہا میں اس فعل سے برأت کا اظہار کرتا ہوں"
حضرت خالد پر اس درجہ شرمندگی اور ندامت طاری ہوئی کہ انہوں نے فرمایا:-

---

[1] کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟

"کاش میں نے اس واقعہ کے بعد اسلام قبول کیا ہوتا!"

اب ایک اور دوسرا واقعہ لیجئے،

وہ نام نہاد مسلمان جنہیں قرآن اور حدیث نے منافقین کے نام سے یاد کیا ہے اسلام کے بدترین دشمن تھے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنی ایذائیں منافقین سے پہونچیں، کافروں سے بھی نہیں پہونچیں۔

کیا یہ منافقین وہی نہیں تھے جن کے نفاق کا پردہ بار بار قرآن نے ہی چاک کیا ہے؟

کیا یہ منافق وہی نہیں تھے جن کی زبان مسلمان تھی، اور دل کافر تھا!

کیا وہ منافقین ہی نہیں تھے جو راہِ اسلام میں سنگِ گراں بن کر بار بار حائل ہوا کرتے تھے؟

کیا وہ منافقین کے سوا کوئی اور تھا جو اسلام کی فلاح و فروغ سے متعلق ہر اسکیم کو سبوتاژ کرنے کی سعی بلیغ کرتا رہتا تھا؟

کیا وہ منافقین ہی نہیں تھے جو جنگ کے موقع پر، خطرے کے موقع پر نہ صرف یہ کہ آنحضرتؐ کا ساتھ نہیں دیتے تھے بلکہ مسلمانوں میں ہراس پیدا کرتے تھے، ان کی حوصلہ شکنی کرتے تھے، ان میں بددلی اور مایوسی پیدا کرتے تھے؟ انہیں اپنے ساتھ میدانِ جہاد سے واپس چلنے کی ترغیب دیتے تھے؟

تاریخ کے اوراق کھلے ہوئے ہیں، جس کا جی چاہے مطالعہ کرلے اور معلوم کر لے کہ وہ منافقین ہی تھے جو ابولہب سے زیادہ اسلام کے دشمن اور یہود سے کہیں زیادہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنِ جاں تھے۔

لیکن کیا آپؐ نے ان مخالفین کو، دائرۂ اسلام سے خارج کرنے کا اعلان فرمایا۔
کیا آپؐ نے ان مخالفین تک کو معاف نہیں فرما دیا جنھوں نے ام المومنین — حضرت عائشہ صدیقہ پر تہمت لگائی تھی؟ بلکہ ان کا جو آذوقہ مقرر تھا وہ تک بند نہیں ہونے دیا۔
کیا آپؐ نے ان منافقین کے بارے میں کوئی ایسی بات ارشاد فرمائی جس سے ان کا چہرۂ زشت بے نقاب ہو جاتا؟
کیا آپؐ نے انہیں کوئی سزا دی؟
ان پر عتاب کا اظہار بھی کبھی آپؐ نے کیا؟
کیا ہر مرتبہ ان کی بڑی سے بڑی غلطی کو آپؐ نے معاف نہیں فرما دیا۔
کیا آپؐ نے منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی کے مرنے پر اپنا پیراہن مبارک کفن کے لیے بغرض برکت مرحمت نہیں فرمایا؟
کیا آپؐ نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی؟
یہی وہ منافق اعظم تھا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں آپؐ کو تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:-
"اگر تم ستر مرتبہ بھی دعائے مغفرت اس کے لیے کرو گے تو وہ قبول نہ ہوگی"
اور پھر کیا آپؐ نے نہیں فرمایا تھا:-
"اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ دعائے مغفرت کروں تو وہ قبول ہو جائے گی تو میں ایسا بھی کرتا"؟
جس داعی اسلامؐ کا یہ اسوۂ حسنہ اور یہ سیرت مبارک ہے، اس کے نقش قدم پر چلنے والے، اگر "پیدائشی مسلمان" ہونا ایک جرم قرار دیں اور اس پر طنز کریں، اور ان پیدائشی مسلمانوں کی اسلام کے لیے قربانی، ایثار و فدویت، ہر چیز کو نظر انداز کر دیں تو

کیا یہ بہت بڑا المیہ نہیں ہے؟ ——— آسماں راحق بود گر خوں ببارد
برزمیں!"

یہ میرا بے دلیل دعویٰ نہیں ہے، اس دعوے کا ثبوت بھی رکھتا ہوں:-

"ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس لیے کہ وہ لفظاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔"

..... یہ طنز کا پہلا تیر تھا!

طنز کا دوسرا تیر جو پہلے سے کہیں زیادہ جگر خراش ہے یہ ہے:-

"یہ "انبوہ عظیم" جسے مسلمان کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔"

.....!

یہ تیر کھایئے، اور کلیجہ چھلنی کرا لیجیے، لیکن اسے نہ بھولیے کہ یہ "انبوہ عظیم" جس کے "۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، وہی ہیں جو داعی اسلام کی توہین برداشت نہ کر سکے، اور لیکھرام، شردھانند اور راجپال وغیرہ کے سینے میں خنجر گھونپ کر ہنستے مسکراتے پھانسی پر چڑھ گئے اور سعادتِ ابدی و نعمتِ سرمدی سے ہمکنار ہو گئے، یہی ہیں وہ شمع نبوت کے پروانے جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا:-

ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ!
ہے لہو جن کا تقدس میں حرم سے بڑھ کر!

یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام کی حرمت پر جان دے دی، اور اسلام کا عرفان رکھنے والے "سرگشتۂ خمار رسوم وقیود" بنے رہے!

اسی سلسلہ کلام میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:-

"نہ ان (پیدائشی مسلمانوں) کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویّہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے کو، اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے"!

.............!

گویا یہ صرف نام کی سزا تھی جو بہار، بنگال، اڑیسہ، گڑھ مکیشر اور مشرقی پنجاب وغیرہ کے قتل عام کی صورت میں دی گئی۔ ورنہ وہ لوگ جنہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا تھا اور باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا تھا، صاف طور پر اس قتل عام سے بچ گئے! ــــــ ہاتھ لا استاد، کیوں کیسی کہی؟

اسی سلسلۂ کلام کی آخری کڑی:-

"ان پیدائشی مسلمانوں کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے"![1]

....

غور کیجیے تو مولانا کی ان چند سطروں میں جہانِ معنی آباد ہے!

---

[1] "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم، ص ۱۰۵

مولانا مودودی کا رویہ "پیدائشی مسلمانوں" کے ساتھ کیسا ہی رہا ہو، انہوں نے ان مسلمانوں پر جنہوں نے استقلال و حریت کی تحریکوں میں سرفروشانہ حصہ لیا کتنے ہی خلاف واقعہ اور جگر فگار حملے کیوں نہ کیے ہوں، اور ان کے اخلاص پر کتنا ہی تمسخر کیوں نہ کیا ہو، میں یہ حربے مولانا کے خلاف استعمال کرنا نہیں چاہتا، میں تسلیم کیے لیتا ہوں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اخلاص کے ساتھ کہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود میں یہ عرض کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ میں انہیں معصوم مانتا ہوں نہ مطاع مطلق تسلیم کرتا ہوں، یہ حق تو صرف رسولؐ کا ہے، کسی اور کا نہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا اور "عظیم" کیوں نہ ہو، رسالت ختم ہو چکی، اور اب جملہ اعاظم و اکابر کے بارے میں وہی بات کہی جا سکتی ہے جو ایک موقعہ پر امام شافعی نے فرمائی تھی، یعنی:-

ھم رجال ونحن رجال [1]

مخلص ہونا دوسری چیز ہے، اور برسر صواب ہونا شئے دیگر، کئی ایسے بزرگ تھے، تحریک پاکستان کے زمانے میں ہم نے ان کی مخالفت یہ جانتے ہوئے کی کہ وہ لوث اغراض اور حب جاہ سے پاک تھے، یہ ہم نے اس لیے کیا کہ ہمارے نقطۂ نظر سے ——— وہ یکسر غلط تھے، پھر یہی بات مولانا مودودی کے لیے

کیوں نہیں روا ہو سکتی؟

مولانا کی مذکورہ تحریر سے جو نتائج مترتب ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:-

---

[1] "وہ بھی آدمی تھے ہم بھی آدمی ہیں"!
یعنی غلطی کا صدور جس طرح ہم سے ہو سکتا ہے۔ اکابر امت سے بھی ہو سکتا ہے۔

۱ :۔ جو لوگ نسلاً مسلمان چلے آرہے ہیں، انہیں حقیقی مسلمان فرض کر لینا غلط ہے۔

۲ : "نسلی" مسلمانوں کے اجتماع یعنی کثرت رائے سے جو کام انجام پائے گا وہ اسلامی اصول پر مبنی ہو، یہ تصور کر لینا پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔

۳ :۔ مسلمان قوم صرف "ایک انبوہ عظیم" ہے ——— فہم سے خالی اور عقل سے عاری۔

۴ ۔ اس "انبوہ عظیم" کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔

۵ اس "انبوہ عظیم" کا ذہنی رویہ اور اخلاقی نقطۂ نظر بھی اسلام کے مطابق تبدیل نہیں ہوا ہے۔

۶ یہ صرف اس لیے مسلمان ہیں کہ ترکۂ پدری اور جائداد موروثی کی طرح اسلام بھی انہیں وراثت میں ملا ہے۔

۷ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول نہیں کیا ہے۔

۸ نہ باطل کو باطل جان کر ترک کیا ہے۔

۹ اس "انبوہ عظیم" کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر یہ سمجھنا کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی، قابلِ داد خوش فہمی ہے۔

آئیے اب ان ارشادات پر جدا جدا ایک سرسری اور طائرانہ نگاہ ڈال لیں،

---

① سوال یہ ہے کہ اسلام نے ——— اسلام سے میری مراد ہے کتاب و سنت ——— کہاں اور کس موقع پر نسلی مسلمانوں میں اور حقیقی مسلمانوں میں تفریق کی ہے وہ کون سا معیار ہے جس سے آپ کھوٹے (نسلی) مسلمان اور کھرے (حقیقی مسلمان)

میں تمیز و تفریق کر سکتے ہیں۔

جہاں تک وحدانیت کا تعلق ہے، ایمان بالرسل ـــــ آں حضرتؐ اور آپؐ سے قبل کے انبیاء[ل] ـــــ کا تعلق ہے۔ نیز جملہ بنیادی اور اساسی عقائد کا تعلق ہے، نسلی مسلمانوں اور حقیقی مسلمانوں میں کیا فرق ہے؟

کیا نسلی مسلمان ایک کے بجائے کئی خدا مانتے ہیں۔

کیا وہ محمدؐ (بابانا و امہاتنا) کی رسالت پر غیر مشروط ایمان و اعتقاد نہیں رکھتے؟

کیا وہ نعوذ باللہ نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کو فعل عبث قرار دیتے ہیں؟

آخر کس اختیار Authority کی بنا پر آپ نے نسلی اور حقیقی مسلمانوں کے مابین یہ حدِ فاصل قائم فرمائی۔

کیا "حقیقی مسلمان" وہ ہے جو ان تمام معتقدات کا باغی ہو جو نسلی مسلمانوں کو ابًا عن جدٍ متوارث طور پر ملتے رہے ہیں؟

صاف کہہ دیجیے، آپ نسلی مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے، جو حقیقی مسلمان نہیں وہ سرے سے مسلمان ہی کب ہے؟ اسلام کا تعلق، قلب، ضمیر اور عقیدے سے ہے۔ آپ کو یا کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جسے چاہیں "نسلی مسلمان" کا طعنہ دے کر اسلام سے خارج کر دیں، اور جسے چاہیں "حقیقی مسلمان" ہونے کی سند مرحمت فرما کر حلقۂ اسلام میں داخل کر لیں۔!

کفر و اسلام کا مسئلہ بہت دقیق اور نازک ہے، اکابر امت کا مسلک تو یہ رہا ہے کہ ۹۹ وجوہ کفر موجود ہوں، اور صرف ایک سبب (خواہ تاویلاً سہی) اسلام کا موجود ہو تو وہ ۹۹ وجوہ کفر مسترد ہو جائیں گے اور ایک سبب کی بنا پر اسلام قبول کر لیا

[ل] والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک ـــ!

جائے گا۔ بڑی سے بڑی فکری غلطی پر بھی کفر کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا جب تک غلطی کرنے والا تاویل کی آڑ لے رہا ہو،

یہاں تو یہ صورت بھی موجود نہیں ہے، پھر نسلی اور حقیقی کی یہ حد بندی کیا سراسر روح اسلام کی منافی نہیں ہے؟

اور یہ لوگ جنہیں آپ "نسلی مسلمان" قرار دے کر گویا بہت بڑا طعنہ دے رہے ہیں کیا وہی نہیں ہیں کہ جب کبھی اسلام پر کوئی نازک وقت آیا کفن سر سے باندھ کر میدان میں اتر آئے؟

کیا وہ نسلی مسلمان ہی نہ تھے جنہوں نے ۱۹۱۱ء میں مسجد مچھلی بازار کانپور کے تحفظ کے لیے انگریزی فوج کی گولیاں اپنے سینے پر روکی تھیں، اور سنگینیں کھانے کے لیے کھلے ہوئے سینے آگے کر دیے تھے؟

کیا وہ بھی نسلی مسلمان ہی نہیں تھے جنہوں نے ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج لاہور کو انہدام سے بچانے کے لیے، دیوانہ وار اپنی جانیں قربان کر دی تھیں، اور حقیقی مسلمان دور سے کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

کیا وہ بھی نسلی ہی مسلمان نہیں تھے جنہوں نے جزیرۃ العرب کو فرنگی استیلاء سے نجات دلانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی؟

کیا وہ بھی نسلی مسلمان ہی نہیں تھے جنہوں نے خلافت اسلامیہ کے حفظ و بقا کے لیے دنیا کی سب سے بڑی سامراجی سلطنت سے ٹکر لی تھی؟ جیل بھر دئے تھے، پھانسی کے تختوں پر لیٹے تھے۔ جائدادیں نیلام کرا دی تھیں، ہجرت کر کے ایک اجنبی ملک میں متاع و فرزند و زن سے بے نیاز ہو کر جا پہونچے تھے،

کیا یہی نسلی مسلمان نہیں تھے جنہوں نے کل مومن[1] اخوۃ کے ماتحت

---

[1] سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

ایران کے مظلوم مسلمانوں کے لیے، طرابلس کے کشتۂ ستم کلمہ گویانِ اسلام کے لیے مشہد مقدس کے ہدفِ جور اسلامیوں کے لیے، مصر کے دور دست لیکن آشفتہ حال اسلام کے نام لیواؤں کے لیے، جان و مال کی قربانی دینے سے کبھی دریغ کیا تھا؟

حیف ہے اگر ان اسلام کے پرستاروں کو "نسلی مسلمان" کہہ کر چڑایا جائے!

---

(۲) آپ فرماتے ہیں نسلی مسلمانوں کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا، اس کے بارے میں امید رکھنا کہ وہ اسلامی اصول پر مبنی ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔

میں یہ عرض کرتا ہوں کہ نسلی مسلمانوں کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا، وہ اس وقت تک اسلامی اصولوں پر مبنی قرار دیا جائے گا، جب تک واضح طور پر اسلام کے خلاف نہ ہو، یہ فیصلہ صرف وجدان سے نہیں کیا جاسکتا، اس کے لیے ٹھوس اور ناقابلِ تردید ثبوت ضروری ہے، محض سوءِ ظن کی بنا پر اتنا بڑا فیصلہ کر دینا نہ تدبر ہے، نہ اسلامیت، نہ حقیقت پسندی، اسے صرف ایک واہمہ قرار دیا جاسکتا ہے، اور حقائق کے بازار میں توہمات کا "سکہ" نہیں چلتا، وہاں تو حقائق ہی کا چلن ہوتا ہے اور وہی ہونا بھی چاہیے۔

---

(۳) عامۂ مسلمین کو "ایک انبوہ عظیم" کہنا، کوئی شبہ نہیں ایک بہت بڑا طنز ہے لیکن اوچھا!

ایک پوری قوم کو حقارت سے انبوہ عظیم کہہ کر اس کا دل تو دکھایا جاسکتا ہے لیکن اس لفظ کے استعمال سے کون سا دینی، علمی، یا فقہی فائدہ مدِنظر تھا یہ آج تک نہ معلوم ہوسکا، اس طنز کے بغیر بھی مفہوم ادا کیا جاسکتا تھا، اصل مقصد ظاہر ہے ادائے مفہوم تھا نہ کہ دل آزاری، لیکن اس فقرے سے تو ایسا معلوم ہے کہ ادائے مفہوم

کی حیثیت ثانوی ہے، اور پوری قوم کی دل آزاری اصل مقصد، ——— شوخی بھی کلام میں لیکن نہ اس قدر!

---

④ پھر ایک دوسرا تیر اس "انبوہ عظیم" کے سینے پر یوں چلایا ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں — بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں ———

اگر علم سے مراد وہ علم ہے جو ائمہ اور مجتہدین کا ہے تو یہ بات بالکل بجا اور درست ہے، اور یہ بات جملہ عامۂ مسلمین پر صادق آتی ہے خواہ وہ نسلی ہوں یا حقیقی، اور جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ ہر مسلمان سے اس علم کے حامل ہونے کا مطالبہ بھی نہیں کرتا[1]

ایک مسلمان کے لیے جو علم ضروری اور ناگزیر ہے وہ ہے فرائض، واجبات سنن، اوامر، نواہی اور حرام و حلال کا،

یہ علم اگر مسلمانوں کو حاصل ہے تو بڑی اچھی بات ہے اور اگر نہیں حاصل ہے تو اس کی ذمہ داری ان سے زیادہ علمائے کرام پر ہے، لیکن ہر صورت میں ان کا اسلام اور ایمان شک و شبہ سے بالا ہے،

---

⑤ اس "انبوہ عظیم" کا ذہنی رویہ اور اخلاقی نقطۂ نظر بھی جماعت کی بارگاہِ قدس میں مشکوک و معتوب ہے۔

لیکن اس کی نشان دہی بھی تو ہونی چاہیے تھی کہ آخر وہ کون سا ذہنی رویہ

---

[1] فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون ۝

ہے جو موجبِ اعتراض ہے اور وہ کون سا اخلاقی نقطہ نظر ہے جو ناقابلِ قبول ہے؟

کسی ملت یا قوم کے تمام افراد صالح نہیں ہوتے، ہو بھی نہیں سکتے، خود یہ جماعتِ اسلامی جو ازروئے تعداد قوم اور ملت کے مقابلے میں ایک آب جو کی حیثیت رکھتی ہے اپنے افراد کے بارے میں صالحیت عامہ کا دعویٰ نہیں کر سکتی، لہذا یہ مبہم اعتراض جوشِ غضب کا آئینہ دار تو ہے، لیکن واقعات و حقائق کی کسوٹی پر اگر اسے کسا جائے تو قطعاً پادر ہوا نظر آئے گا۔

---

(۶) یہ طعنہ کہ اس انبوہ عظیم میں "باپ سے بیٹے کو، اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں" بہت بڑا اور بہت برا طعنہ ہے، کیا اس طعنے کا صاف اور واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ مسلمان بس نام کے مسلمان ہیں ورنہ اسلام سے انہیں دور کا واسطہ بھی نہیں؟

اگر ان الفاظ کا یہی مطلب ہے، اور یقیناً یہی ہے تو ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر پند و تبلیغ، اور تذکیر و موعظت کا یہ کون سا اصول ہے؟ دل موہنے کا طریقہ طمانچہ مارنا نہیں ہوتا۔ تسخیرِ قلوب کے لیے بڑی نفس کشی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ذرا ان صوفیا کے احوال و سوانح پر ایک نظر ڈالیے جو کفرستانِ ہند میں اسلام پھیلانے اور لوگوں کو اسلام کا راستہ دکھانے آئے تھے۔

کیا ان کا اندازِ تخاطب یہی ہوتا تھا؟ اگر یہی ہوتا تو وہ کامیاب ہو سکتے تھے قرآن تو کافروں تک کے ساتھ، تجادلہ احسن کی تلقین کرتا ہے [1]

---

[1] وجادلھم بالتی ھی احسن ۵

ہمارے صوفیاء نے کافروں اور اسلام کے دشمنوں سے میٹھے بول بولے اور ان کے دل جیت لیے، آپ مسلمانوں سے کڑوے بول بولتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے دامنِ عاطفت میں آجائیں گے، یہ اگر سادہ لوحی ہے تو قابلِ رحم ہے حسنِ ظن ہے تو قابلِ داد ہے۔

شنیدم کہ مردانِ راہ خدا
دل دشمناں را نہ کردند تنگ
ترا کے میسّر شود ایں مقام
کہ با دوستانت خلافست و جنگ؟

---

⑦ اتنا کچھ فرما چکنے کے بعد بھی، ابھی کئی تیر ہیں جو ترکش میں موجود ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان نسلی مسلمانوں نے حق کو حق جان کر قبول نہیں کیا ہے، یعنی اگر حق قبول بھی کیا ہے تو محض از راہ تفنّن! ——— سبحان اللہ!

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تیری تقدیر کو رو آئے!

یہ کیسا ستم ہے کہ حق قبول کرنے پر بھی جان بخشی نہیں ہوتی، اس سوال کا جواب بھی طلب کیا جاتا ہے کہ تم نے حق کیوں قبول کیا؟ گویا حق کا قبول کرنا بھی ایسا حادثہ ہے جس پر جواب طلب کیا جا سکتا ہے!

---

⑧ جس طرح حق کا قبول کرنا امتحان دیے بغیر قابلِ قبول نہیں، اسی طرح باطل کو ترک کر دینا بھی امتحانی مرحلوں سے گزرے بغیر مستحسن نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ حق کو قبول کرنا، اور باطل کو ترک کر دینا بجائے خود کوئی سزاوارِ تحسین فعل

نہیں، یہ خیر اس وقت تک شر رہے گا جب تک ترکِ باطل اور قبولِ حق کے اسباب و علل اور عوامل و محرکات پر تشفی بخش بیان صفائی نہ پیش کیا جائے۔

---

⑨ آخری تنقیح یہ ہے کہ اس "انبوہِ عظیم" کے ہاتھ میں باگیں دے کر یہ امید رکھنا کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی، قابلِ داد خوش فہمی ہے۔

یہ مضمون جس کا اقتباس سطورِ بالا میں پیش کیا گیا ہے اور جس پر تنقیحات قائم کی گئی ہیں، ان مسلمانوں کے لیے لکھا گیا ہے جو پاکستان کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اس کا عنوان ہے:-

"پاکستانی خیال کے لوگ!"

غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام کے راستے پر گاڑی چلانا ایک مسلم مملکت میں ممکن ہے یا ایک غیر اسلامی ملک میں؟ کراچی میں یا واشنگٹن میں؟ لاہور میں یا لندن میں؟ راولپنڈی میں یا پیرس میں؟ ڈھاکہ میں یا دہلی میں؟

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ایک چوتھائی تھی، اس کے معنی یہ تھے کہ وہ غیر معمولی اقلیت میں تھے، اور ہندوؤں کو غیر معمولی اکثریت حاصل تھی یعنی ۲۵ ایک طرف، ۷۵ ایک طرف، یہ ۲۵ کسی طرح بھی ۷۵ پر غالب نہیں آسکتے تھے۔ کیونکہ انگریز ہندوستان کو جمہوری حکومت کا تحفہ دے کر رخصت سفر باندھنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور ــــ

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے!

اور اس گنتی میں مسلمان کسی شمار قطار میں نہ تھے۔

مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ جماعت اسلامی کے قیام کے باوجود وہ منتشر

اور پراگندہ تھے، ان کی ایک معقول تعداد کانگرس کے ساتھ تھی، اس لیے کہ مستقبل کی عافیت وہ اسی میں دیکھ رہی تھی۔ ایک اور گروہ تھا جو کمیونزم کے چکر میں پھنسا ہوا تھا، اس کا خیال تھا کہ جملہ امراض قومی و ملی کا مداوا صرف اشتراکیت میں ہے، کچھ اور مسلم جماعتیں تھیں جو مرغِ بادنما کی طرح ہر آن اپنی پالیسی میں تبدیلی کرتی رہتی تھیں۔ عامۂ مسلمین حیران و سرگشتہ تھے کہ کیا کریں؟ کدھر جائیں؟ کون سا راستہ اختیار کریں؟ ان حالات میں مسلمان قوم کا وجود خطرہ میں تھا، ——— اسلام خطرے میں تھا—!

یہ حالات تھے جب محمد علی جناح نامی ایک کھن سال شخص میدان میں آیا...!

یہ ہمیشہ سے نیشنلسٹ تھا۔

کبھی بھی یہ فرقہ پرست نہیں رہا تھا،

لیکن اس کا دل سوزِ یقین سے معمور تھا، اس کے دل میں اسلام کی محبت جاگزیں تھی۔ اپنے نیشنلزم کے دورِ عروج میں بھی اس نے اپنی قوم کو فراموش نہیں کیا تھا، یہی تھا جس نے ۱۹۱۶ء کے کانگرس سشن میں مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین برابر کی صلح کرائی تھی، جو "لکھنؤ پیکٹ" کے نام سے مشہور ہے۔

اپنے نیشنلزم کے دورِ شباب میں بھی یہ شخص اسلامی حمیت سے ناآشنا نہ رہا۔

اس نے چالیس سال کی عمر میں ایک غیر مسلم لڑکی سے محبت کی، لڑکی کے اربپتی خاندان کو سول میرج پر کوئی اعتراض نہ تھا، یہ سول میرج کر لیتا تو کوئی طوفان نہ اٹھتا، کسی طرح کی ہنگامہ آرائی نہ ہوتی، لیکن یہ عاشق صادق سول میرج پر تیار نہ ہوا، یہ عاشق

تھا، لیکن محبوبہ سے رفاقتِ حیات کی شرط اسلام رکھی، اسے اسلام
کی دعوت دی اور جب وہ مسلمان ہو گئی تو شادی کر لی،
اس کا نیشنلزم اتنا بے داغ تھا کہ گاندھی جی اور موتی لال، سروجنی نائیڈو
اور مسز اینی بسنٹ سب اس کے سامنے سرنیاز خم کرتے تھے۔
لیکن مسلمانوں کی کسمپرسی اور ان کے بھیانک مستقبل کا نظارہ کر کے یہ تڑپ
اٹھا، اس نے اپنے نیشنلزم کو خیر باد کہا ۔ یہ فرقہ پرست بن گیا ۔ یہ اپنی قوم کے سامنے
آیا اور اس سے مخاطب ہو کر گویا ہوا :۔
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفان بھی ہے ۔
اس نے اپنی قوم کو للکارا، اور گرج کر کہا :۔
ع تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے!
اس نے اپنی قوم کے ہاتھ سے وہ "چند کلیاں" لے کر مسل دیں، انہیں پاؤں
تلے روند ڈالا اور تنگیٔ داماں کا علاج پاکستان تجویز کیا ــــ!
پرسند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد!
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن؟
یہ بوڑھا لیکن جوان ہمت شخص، پاکستان یعنی ایک آزاد مسلم مملکت کا پرچم
لے کر میدانِ جہاد میں اترا، اس نے انگریزوں سے جنگ کی، اس نے ہندوؤں سے
جنگ کی، اس نے اپنی قوم سے لڑائی مول لی،
اور جس وقت یہ پاکستان کی جنگ لڑ رہا تھا، مسلمانانِ ہند کے لیے ایک
آزاد، اور خود مختار مملکت کے قیام و تشکیل کے لیے کوشاں تھا، اسے اور اس
کے ساتھیوں کو "ابوہ عظیم" کے خطاب سے جماعت کے دارالامارۃ سے نوازا

جارہا تھا، انہیں نسلی مسلمان ہونے کا طعنہ دیا جارہا تھا، انہیں چڑایا جارہا تھا کہ گو تم حق پر ہو لیکن تم نے حق کو حق سمجھ کر نہیں قبول کیا ہے۔ گو تم باطل ترک کر چکے ہو، لیکن تم نے باطل کو باطل سمجھ کر ترک نہیں کیا ہے۔

ان مسلمانوں سے جو آزاد مسلم مملکت ——— پاکستان ——— کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے فرمایا جارہا تھا تم نے تو مسلمان کا نام وراثت میں پایا ہے ورنہ اسلام سے تمہیں کیا متعلق؟

وہ مسلمان جو کفر کی باطل دستی کے خلاف مورچہ قائم کیے ہوئے تھے، اور تن من دھن کی قربانی دے کر ایک آزاد مسلم مملکت کی تخلیق کے لیے ساعی تھے، ان سے کہا جارہا تھا اگر تمہارے ہاتھ میں باگیں دے دی گئیں تو یہ امید رکھنا کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی، قابلِ داد خوش فہمی ہے۔

طنز و تعریض کے یہ تیر برسانے کے بجائے اگر المیہ ہوتا کہ تحریک پاکستان کی قیادت جماعت اسلامی نے خود اپنے ہاتھ میں لے لی ہوتی، اور اپنے رفقاء کے ساتھ میدانِ جہاد میں کود پڑی ہوتی تو شاید یہ باتیں اچھی لگتیں،

لیکن اس تحریک سے الگ رہنا، اس تحریک کے مجاہدوں اور سرفروشوں کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہونے کی کوشش کرنا، ایک آزاد مسلم مملکت کی تخلیق کے تصور سے نہ صرف بے نیازی اور سرد مہری کا برتاؤ کرنا بلکہ اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دینا، کتنی بڑی ستم ظریفی تھی۔

بلاشبہ تاریخ کے اوراق اس ستم ظریفی کو زندۂ جاوید بنا چکے ہیں۔

ہر شاعر، ادیب، اور انشا پرداز اپنے طرزِ اسلوب میں یکتائی کا مالک ہوتا ہے۔ اس طرزِ اسلوب کا کوئی خاص پہلو ایسا ہوتا ہے جو اسے بہت زیادہ ممتاز

بنا دیتا ہے۔

مثلاً امام غزالیؒ روحانی احوال و مقامات کی گرہ کشائی جس دل میں اتر جانے والے انداز میں کرتے ہیں وہ صرف انہی کا حصہ ہے۔

سعدی شیرازی جس سہل ممتنع انداز میں نثر نگاری اور شاعری کرتے ہیں اس میں کوئی ان کا حریف نہیں۔

مولانا رومؒ اپنے اشعار میں جس انداز بدیع کے ساتھ ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جو بظاہر پیش پا افتادہ ہوتی ہیں اور حقیقتاً ایک گنج معانی اپنے اندر نہاں رکھتی ہیں یہ چیز آج تک کسی کو میسر نہ آسکی۔

مولانا مودودی کی تحریر کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مثالوں سے خوب کام نکال لیتے ہیں ان امثال میں بلاغت بھی ہوتی ہے طنز بھی اور معنویت بھی لیکن کبھی کبھی ان کی پیش کی ہوئی مثالیں خود ان کے خلاف ایک شاہد بن جاتی ہیں مثلاً بزعم خود تحریک پاکستان کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیرتے ہوئے اور اس تحریک کے رہنماؤں کو گویا بے نقاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"فرض کیجئے میں سطح زمین سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں، تو لامحالہ میں وہی ذریعہ تلاش کروں گا جو مجھے اوپر کی طرف لے جا سکتا ہو، خواہ ابتداً وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اٹھا سکے۔ ایسا ذریعہ نہ ملے گا تو میں سطح زمین پر ہی قیام پسند کروں گا۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ میں اوپر جانے کے ارادے سے ایک برقی جھولے میں بیٹھ کر کسی کوئلے کی کان میں اترنا شروع کر دیتا ہوں۔ اور راستے سے اس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپ کو میرے فاتر العقل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہوگا؟

بالکل اسی طرح آپ کو میرے فتورِ عقل میں اس وقت بھی شبہ نہ ہونا چاہیے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہونچنے کے لیے ان لوگوں کے پیچھے چلا جا رہا ہوں، جن کی عملی زندگی میں اور جن کے خیالات، نظریات اور سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی، جن کا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں۔ [1]

.........!

دس ہزار فٹ کی بلندی، اور کوئلے کی کان کی مثال دلچسپ تو ضرور ہے لیکن افسوس واقعیت اور صداقت سے اس درجہ خالی ہے کہ واقعی نارسائی عقل کا کرشمہ نظر آتی ہے۔

صورتِ احوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے دو بدترین دشمن —— انگریز اور ہندو —— الکفر ملۃ واحدۃ بن کر مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ مغربی جمہوریت نافذ کر کے مسلمان اقلیت کو ہندو اکثریت کا دائمی غلام بنانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ دو گروہوں میں بٹا ہوا ہے ایک وہ ہے جو انگریز کا قدیم نمک خوار، پشتینی وفادار اور اس کے جاہ و جلال

لہ راہ رو پشت بہ منزل۔
(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۹۰)

سے مرعوب ہے اور اس کے لیے دعائے ترقی و اقبال میں ہمہ تن مصروف ہے۔
دوسرا گروہ وہ ہے جو ہندوؤں سے متاثر، مرعوب اور دہشت زدہ ہے اور اس میں نہ صرف، جدید تعلیم یافتہ اصحاب شامل ہیں بلکہ علمائے دین اور فقیہانِ شرع متین کی بھی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ اس گروہ کو اس بات کا یقین ہے کہ ہندو اکثریت کا تابع بن کر رہنا ہی مسلم اقلیت کے لیے مفید اور مناسب ہے۔ چنانچہ غیر مشروط طور پر یہ کانگرس کے ساتھ ہے۔ مسلم عوام ان دو دلوں گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

ان حالات میں ایک سال خوردہ شخص محمد علی جناح جو انگریزوں کا مزاج شناس بھی ہے اور ہندوؤں کے اسرار و رموز کا آشنا بھی، میدان میں آتا ہے، وہ ہندوؤں کو بھی للکارتا ہے اور انگریزوں کو بھی، اور دونوں کو مخاطب کر کے عزیمت اور استقامت کی پوری شان کے ساتھ کہتا ہے:-

"تم مسلمانوں پر حکومت نہیں کر سکتے، تم مسلمانوں کو غلام نہیں بنا سکتے تم مسلمانوں کو فروخت نہیں کر سکتے اور اگر تم ایسا کرنا چاہو گے تو ایک ایک قدم پر تمہاری مزاحمت کی جائے گی"

یہ نئی آواز تھی!

بالکل انوکھی اور عجیب آواز تھی یہ

اس آواز کو سن کر انگریزوں نے قہقہہ لگایا ——— حقارت کا قہقہہ۔

اس آواز کو سن کر ہندو ہنس پڑے ——— خندۂ استحقار!

مسلمان اس آواز کو سن کر چونک پڑے، ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا پھر اس بوڑھے شخص کی طرف دیکھا، اور زبانِ حال سے بے ساختہ کہہ اٹھے ——

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی؟

اور پھر اس کے ساتھ ہو لیے ـــــ!

عوام بڑے باشعور، مردم شناس، اور حقیقت بیں ہوتے ہیں، وہ لیڈر کے انتخاب میں کبھی غلطی نہیں کرتے، سرسید سے لے کر محمد علی جوہر تک، ایک مرتبہ بھی انھوں نے ذرا دیر کے لیے بھی کسی غلط لیڈر کا انتخاب نہیں کیا، انھوں نے جناح کو ـــــ جسے اب تک وہ زعیم ملت ماننے سے انکار کرتے رہے تھے ـــــ قائد اعظم مان لیا، یہ نیا لیڈر انہیں انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی سے آزادی کی نوید دے رہا تھا،

یہ عوام جانتے تھے اور بہت اچھی طرح جانتے تھے، ہندو سامراج اور برطانوی استعمار کے پھندے سے نکل کر ایک آزاد، اور خود مختار قوم کی حیثیت سے وہ اپنی قسمت کے، اپنے مستقبل کے، مالک ہوں گے، کسی غیر کو ان کے معاملات میں مداخلت اور بالا دستی کا حق نہ ہوگا، وہ جس طرح چاہیں اپنی قسمت کی تشکیل کر سکیں گے، وہ جس طرح چاہیں اپنا مستقبل سنوار سکیں گے،

یہ بڑا نازک وقت تھا۔

اس کٹھن گھڑی میں ہر اس شخص کا جو مسلمانوں کو آزاد دیکھنا چاہتا تھا فرض تھا کہ وہ اس بوڑھے لیکن جواں ہمت زعیم کا ساتھ دیتا،

اور یہ فرض ان لوگوں پر اور زیادہ شدت کے ساتھ عائد ہوتا تھا جو "اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے" اور "فاروقی حکومت کے نصب العین" تک پہونچنے کے لیے بے چین اور بے قرار تھے، "جن کی عملی زندگی میں اور جن کے خیالات، نظریات، طرز سیاست اور رنگ قیادت" میں کسی "خورد بین" کی مدد کے بغیر اسلامیت کی چھینٹیں نمایاں اور ابھری ہوئی نظر آرہی تھیں، جنہیں "چھوٹے سے

چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک ہر معاملے میں "قرآن کا نقطۂ نظر" خوب معلوم تھا، اس لیے کہ اسلامی حکومت کا احیاء اور فاروقی حکومت کی تجدید بہرحال اسی سرزمین پر ممکن تھی جہاں مسلمان آزاد ہوں۔ اس سرزمین پر یہ خواب ہمیشہ بے تعبیر رہتا جہاں ایک مسلمان اور تین غیر مسلم ہونے جناح کی تحریک پاکستان اگر دس ہزار فٹ کی بلندی تک نہیں لے جا سکتی تھی تو دس فٹ تک تو اونچا اٹھا لے گئی تھی، یہ تحریک وہ جھولا نہیں تھا جو کوئے کی کمان میں پہونچا دیتا تھا۔

لیکن ہوا کیا؟

کیا اپنے دامن پر اسلامیت کی "چھینٹ ہی چھینٹ" رکھنے والے بزرگ میدانِ عمل میں اترے؟

کیا انہوں نے جناح کا ساتھ دیا۔

کیا انہوں نے مسلمانانِ ہند کی ایک آزاد مسلم مملکت کے تصور کی تائید کی تھی؟

کیا انہوں نے مسلمانانِ ہند کے مطالبۂ استقلال و حریت کو اپنایا؟

نہیں ــــ

واقعات کا جواب نفی میں ہے۔

تاریخ کے اوراق پکار پکار کر اس تلخ حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں، یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان ہندو استیلاء اور فرنگی استبداد سے نجات پانے کے لیے کفن سر سے باندھ کر میدان میں اتر چکے تھے اور ہمارا متکلم اسلام ان سے دعوائے اسلام کی سند مانگ رہا تھا، ان کے ایمان کا امتحان کر رہا تھا، اور انہیں "اصلی مسلمان" کہہ کر کفرستان میں بیٹھا بے دردی کے

ساتھ ان کا مذاق اڑا رہا تھا!

جناح اور مودودی کتنا فرق ہے ان دونوں کے نقطۂ نگاہ اور طرزِ عمل میں؟

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی!!

"نسلی" مسلمانوں پر تواتر اور تسلسل کے ساتھ حملوں کا سلسلہ جاری ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے[1]:-

"عموماً جو اجتماعی تحریکیں مسلمانوں میں پھیل رہی ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں، ان کے مقاصد میں غلطی ہے، ان کی قیادت میں غلطی ہے، اور ان کی روحی کیفیت میں غلطی ہے، اکثر سے لوگوں کو تو بے شعوری کی وجہ سے اس غلطی کا احساس ہی نہیں ہوتا، اس لیے وہ جوش و خروش کے ساتھ ان تحریکوں کو چلاتے ہیں، ان کے نزدیک کسی تحریک کے درست ہونے کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ اس میں "مسلمانوں" کا فائدہ ہے!"

.....!

گویا جو چیز مسلمانوں کے لیے مفید ہے وہ اسلام کے لیے مضر ہے! یہ کتنی عجیب منطق ہے!

---

[1] "نسلی مسلمانوں کے لیے دو راہیں"!
"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ دوم ص ۳۴۔

اور مسلمانوں کی یہ اجتماعی تحریکیں، اگر اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں تو ان کی تصویب اور تصحیح کے لیے صریر خامہ کے بجائے فرد عمل پیش کرنے سے کس نے روکا تھا؟

کسی چیز کو صرف غلط کہہ دینا درست طرز کار نہیں، اس غلط کے مقابلے میں صحیح کیا ہے؟ یہ بھی بتانا چاہیے، اور اس صحیح کو منوانے کے لیے جسم و جان کی بازی بھی لگا دینی چاہیے، ورنہ غلط کو عروج اور فروغ حاصل ہوتا رہے گا، اور صحیح گوشۂ عزلت سے قدم باہر نہیں نکال سکے گا!

ایک اور موقعہ پر دل کی بات زیادہ صاف الفاظ میں زبان پر آگئی ہے:-

"اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟"[1]

....

یعنی ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک "بے دین" قوم کی حیثیت سے پاکستان بنا لیا اور "دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں" جدوجہد عمل کا سلسلہ جاری رکھا تو وہ ویسے ہی بے دین ہوں گے جیسے ترکی اور ایران کے لوگ!

---

[1] ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ص ۱۵۸
(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش)

مولانا کے نزدیک اس طرح زندہ رہنے ہیں اور کسی غیر قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں کوئی فرق نہیں،

حالانکہ بہت بڑا فرق ہے۔

اتنا ہی بڑا فرق جتنا "قرآن" اور "ترجمان القرآن" میں ہے!

مسلمان اگر غیر اسلامی زندگی اختیار کر لیں تو بھی اگر وہ آزاد ہیں تو ہر آن اپنی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھال لینے کی طاقت رکھتے ہیں لیکن اگر کسی غیر مسلم قومیت میں فنا ہو جائیں تو کیا ایسا ممکن ہے؟

مثال لیجیے:-!

فرض کیجیے، پاکستان کے مسلمان غیر اسلامی زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن وہ جب چاہیں اس غیر اسلامی نظام کو خالص اسلامی نظام میں تبدیل کر سکتے ہیں، ترکی حکومت "سیکولر" ہے، لیکن اس کی پارلیمنٹ چاہے تو کل ہی اسے جمہوریہ اسلامیہ ترکیہ بنا سکتی ہے، یہی بات مصر، عراق، افغانستان، ایران اور البانیہ وغیرہ کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے۔

لیکن کیا یہی بات ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی صادق آسکتی ہے؟

کیا بھارت کے مسلمان جب چاہیں اسلامی نظام قائم کر لیں؟

کیا یہی بات چینی ترکستان، روسی ترکستان، بخارا، سمرقند، آذربائیجان، قبرص، شمالی افریقہ، فلپائن، وغیرہ کے مسلمانوں پر بھی صادق آسکتی ہے؟

کیا یہ صرف ایک تجویز کے ذریعے اپنا نظام غیر اسلامی سے اسلامی کرنے پر قادر ہیں؟

جواب ظاہر ہے انکار ہی میں ہو سکتا ہے۔

اور اس نفی کا اثباتی پہلو یہ ہے کہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے

قیام کی پہلی شرط آزادی ہے'!

آزادی ——— صرف آزادی

اور جب آزادی کی جدوجہد مسلمان کر رہے تھے' آپ ان پر اور ان کے زعماء پر بے دردانہ تنقید کر رہے تھے'

تو اے کبوتر بامِ حرم چہ می دانی!
تپیدن دل مرغانِ رشتہ بر پارا؟

پھر ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:-

"اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی مستقل سیاسی جماعتیں ہیں، قریب قریب ان سب کا دعوٰی یہی ہے کہ ہمارا — نصب العین اسلامی نصب العین ہے، مگر ان سب نے اس راہ راست کو چھوڑ دیا ہے، وہ نہ تو "الھدیٰ" اور دین حق کی خالص بے آمیز دعوت عام دیتی ہیں، نہ اس پارٹی کی تشکیل کرتی ہیں جس کی قیادت و رکنیت صرف ان لوگوں تک محدود ہو جو واقعی اپنی بندگی اور اطاعت کو اللہ کے لیے خاص کرتے ہیں اور نہ وہ غیر متعلق مقاصد کو چھوڑ کر صرف اس ایک مقصد کو اپنی کوششوں کا ہدف بناتی ہیں، جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے ——— راہ راست کے ان تینوں اجزا سے یہ سب جماعتیں منحرف ہو گئی ہیں!"[۱]

---

[۱] اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں!"
(مسلمان اور سیاسی کشمکش'، حصہ سوم ص ۹۶

یہ تو ایک عام بات ہوئی، آگے چل کر اس اجمال کی تشریح بایں الفاظ ملتی ہے:۔

"دوسرا گروہ زیادہ تر اس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے، یہ لوگ سیاسی فکر تو مغربی ماخذ سے لیتے ہیں، مگر چونکہ موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب[1] ان کے اندر موجود ہے اور مسلمان قوم ہونے کا شعور ان کے اندر بیدار ہو گیا ہے، اس لیے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں "مسلمان قوم" کے لیے اسلام کے نام ہی سے کرنا چاہتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اقوال و اعمال میں، اسلامی اصطلاحات اور مغربی طرز فکر و نظر عجیب طریقہ سے خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں ——— اس گروہ کا راستہ بھی راہ راست کے تینوں اجزاء سے منحرف ہے۔"[2]

.....!

ان سطور سے کیا واضح ہوتا ہے؟

کیا یہ نہیں کہ مسلمان قوم ہونے کا شعور موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب ان کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ ورنہ یہ اسلام سے، راہِ اسلام سے، حقائق اسلام سے اتنے ہی دور ہیں جتنا وہ اعرابی تھا جو کعبہ کو منزلِ مقصود قرار دے کر ترکستان کا سفر کر رہا تھا!

---

[1] تعصب سے مراد عصبیت ہے،

[2] "پاکستانی خیال کے لوگ"

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم، ص ۱۴۳

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
ایں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است!

حالانکہ اسلام کے حق میں اگر کسی کے اندر تعصّب پیدا ہو جاتا ہے، یا کسی میں اپنے مسلمان ہونے کا شعور پیدا ہو جاتا ہے، تو یہ خفا ہونے والی بات نہیں، خوش ہونے کی چیز ہے۔ مسلمان ہونے کا شعور، اور اسلام کے لیے تعصّب، کم از کم اسلام کی طرف پیش قدمی تو ہے'۔

لیکن مولانا اسے بھی انحراف قرار دیتے ہیں، اسلام کی طرف رہروی نہیں مانتے'۔

کاش انہیں احساس ہوتا کہ انھوں نے اپنی نوکِ قلم سے مسلمانوں کے دل کس کس طرح چھید ے ہیں!

مولانا نے ارشاد فرمایا ہے:-

"یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب ویابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں.....!"

.......!

اسی طرح کی بات ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے کہہ سکتا ہے۔ یہ

لے "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے"؟
(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش) حصہ سوم ص ۱۳۰

سطریں پڑھنے سے پہلے اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا"
لیکن حقائق سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا،

اگر میں شاعر ہوتا تو ایک مصرعہ ویسا ہی موزوں کرتا، جیسا اکبر الہ آبادی نے اس وقت موزوں کیا تھا، جب وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے ہندوستانیوں کو کاذب اور جھوٹا کہا تھا، جواب میں اکبر نے کہا،

"جھوٹے ہیں ہم تو آپ ہیں جھوٹوں کے بادشاہ!

لیکن اس تحریک کا محرک کون سا خدشہ یا اندیشہ تھا؟ اسے بھی مولانا کے الفاظ میں سن لیجیے"۔

"اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، تو ان کے ووٹوں سے کبھی مسلمان قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آ سکتے" اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔

اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا ملمّع لیبل لگا ہو گا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے زیادہ جری اور بے باک ہو گی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے!

............!

جس غیر مسلم حکومت کو مجوزہ پاکستان کی قومی حکومت پر ترجیح دی جا رہی ہے
کیا واقعی وہ اتنی ہی صالح اور نیک اور برتر ہے؟
تقسیم ہند کے بعد سے اب تک ہندوستان میں بلا مبالغہ صدہا بلکہ ہزاروں
فسادات ہو چکے ہیں۔
یہ سارے فسادات یک طرفہ ہیں،
ان کی غرض و غایت صرف یہ ہے کہ مسلمانوں یا ہندو بن جائیں، یا موت
کے گھاٹ اتر جائیں، یا جلاوطنی اختیار کر لیں۔
آسام اور تری پورہ میں جو کچھ ہوتا رہا ہے، اور جس کا سلسلہ اب تک جاری
ہے،
کلکتہ کے مسلمان جن روح فرسا حالات سے دوچار ہوئے، اور ہو رہے ہیں
جبل پور کے مسلمانوں پر، صرف مسلمان ہونے کے جرم میں جو قیامت ٹوٹی
اور جس بے دردی سے وہ ہلاک کیے گئے،
مسلمانانِ رورکیلا، اڑلیہ اور جمشید پور، ٹاٹا نگر، جس طرح جرم بے گناہی میں
مارے گئے، اور اب تک ہدفِ ستم اور کشت و خون بنے ہوئے ہیں، کیا ان کا جرم اس
کے سوا کچھ اور تھا کہ وہ مسلمان ہیں؟
ان حقائق کی روشنی میں کیا اب بھی اس "غیر مسلم" حکومت کو پاکستان کی "قومی
حکومت" پر ترجیح دی جا سکتی ہے؟
ہندوستان میں اعلیٰ ڈگریوں کے باوجود مسلمانوں کو ملازمت نہیں ملتی،—
صرف اس خطا پر کہ وہ مسلمان کیوں ہیں؟
فوج اور پولیس کی ملازمت کا دروازہ مسلمانوں پر بند ہے،— محض اس لیے
کہ وہ اسلام کے نام لیوا ہیں۔؟

تجارت، صنعت، اور کاروبار کے کوچے میں وہ قدم نہیں رکھ سکتے ــــ صرف اس لیے کہ ان کا متعلق مسلمان قوم سے ہے۔

اب بھی یہ سیکولر حکومت دیہاتوں اور شہروں کی ہزاروں مسجدوں کو، حتیٰ کہ دہلی کی درجنوں مسجدوں کو ہندوؤں سے واگزار کرا کے مسلمانوں کے حوالے نہیں کر سکی۔

جس ملک میں مسلمان اپنی مسجدوں تک سے محروم کر دیے جاتے ہیں، جہاں ملازمت، کاروبار اور صنعت و حرفت کے ایوان میں ان کا داخلہ ممنوع ہو، جہاں محض اسلام کے نام لیوا ہونے کے جرم میں وہ بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر دیے جاتے ہیں اس ملک کی "غیر مسلم حکومت" "مسلمان ملک کی" "قومی حکومت" پر ترجیح رکھ سکتی ہے؟

یہ کیسی عجیب بات ہے جو مولانا نے اپنے قلم جادو رقم سے تحریر فرما دی؟ اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ واقعات مسلسل ۱۷ سال سے مولانا کے اس نظریہ کو باطل کرتے چلے آ رہے ہیں، مگر انہوں نے اب تک اپنے موقف سے رجوع نہیں فرمایا۔

مجھے مولانا کے بہت سے خیالات پسند ہیں، لیکن ان کی جو چیز سب سے زیادہ ناپسند ہے، وہ عام مسلمانوں کے بارے میں ان کا جذبۂ تحقیر اور اپنے "انا" کے لیے جذبۂ پندار ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ ہم اب ایک ایسے مرحلے پر پہونچ چکے ہیں جہاں مسلسل تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اسلام اور جاہلیت کا یہ ملا جلا مرکب جو اب تک ہمارا نظام حیات بنا رہا ہے، زیادہ دیر

تک نہیں چل سکتا۔

یہ اگر چلتا رہا تو دنیا میں بھی ہماری تباہی کا موجب ہوگا، اور آخرت میں بھی!"[1]

.....!

مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے بڑی حد تک صحیح ہے، یعنی یا تو اسلام کا نظام خالص طور پر بروئے کار آنا چاہیے، ورنہ پھر نظام اسلام کا نام نہ لینا چاہیے،

لیکن مولانا نے اسلام کے مقابلے میں "جاہلیت" کا لفظ مسلمانوں کے لیے استعمال فرمایا ہے۔

جاہلیت کے معنی یہاں اس جہل کے نہیں ہیں جو ہمارے روزمرہ میں بولا اور سمجھا جاتا ہے۔

"جاہلیت" ایک مخصوص اصطلاح ہے۔

"جاہلیت" کا لفظ جب اسلامی روایات و آثار میں آتا ہے تو اس سے مراد قبل از اسلام کی حالت کفر ہے۔

مسلمانوں کے لیے اس لفظ کا استعمال کسی درجہ میں بھی درست اور موزوں نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ صاف

ولا تنابزوا بالالقاب[2]

کے ذیل میں آتا ہے۔

---

[1] "مسلمانوں کا ماضی، حال، اور مستقبل" ص ۶۰

[2] لوگوں کو برے القاب سے مت یاد کرو، (قرآن کریم)

اسلام کی دعوت لوگوں کو پیار اور محبت سے دینی چاہیے، نہ کہ ڈانٹ پھٹکار اور سب وشتم سے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے، اس سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

لوگوں کے دل اپنی طرف مائل کرنے کی یہ ترکیب نہیں ہے کہ معلّم اخلاق یا واعظ وناصح ہنٹر ہاتھ میں لے کر وعظ وتلقین کا سلسلہ شروع کریں،

صحیح طریقۂ تبلیغ یہ ہے کہ دوسروں کی کڑوی کسیلی باتیں سنیں اور خاموش رہیں، مخالفین کی تعریض وطنز کا نشانہ بنیں اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں۔

مولانا کی دعوت اصولی اعتبار سے درست ہونے کے باوجود اب تک جو قبول عام نہ حاصل کر سکی، اس کا سبب سب سے بڑا یہ ہے کہ ان کا اندازِ کلام تلخ اور درشت ہے۔

اس اندازِ کلام سے سرکشی تو پیدا ہو سکتی ہے، طاعت نہیں پیدا ہو سکتی!

معاملہ صرف اسی پر ختم نہیں ہو جاتا، کفر کا فتویٰ بھی موجود ہے:-

" رہے وہ لوگ جنہیں عمر بھر یہ خیال ہی نہیں آتا کہ حج بھی کوئی فرض ان کے ذمہ ہے، دنیا بھر کے سفر کرتے پھرتے ہیں۔ کعبہ یورپ کو آتے جاتے جہاز کے ساحل سے بھی گزر جاتے ہیں جہاں سے مکہ چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے اور پھر بھی حج کا ارادہ تک ان کے دل میں نہیں گزرتا، وہ قطعاً مسلمان نہیں ہیں، جھوٹ کہتے ہیں اگر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، اور قرآن سے جاہل ہے جو انہیں مسلمان سمجھتا ہے۔

ان کے دل میں اگر مسلمانوں کا درد اٹھتا ہے تو اٹھا کرے،

اللہ کی اطاعت اور اس کے حکم پر ایمان کا جذبہ تو بہرحال ان کے
دل میں نہیں ہے[1]

..........!

جو لوگ فریضۂ حج نہیں ادا کرتے، یا یورپ کا سفر تو ذوق و شوق سے کرتے ہیں مگر زیارت حرمین شریفین کے جذبے سے محروم ہیں، ان کے لیے دعا کرنی چاہیے کہ خدا ان میں یہ جذبہ پیدا کرے، لیکن ان کے بارے میں یہ الفاظ واضح یہ کہہ دینا کہ "قطعاً مسلمان نہیں ہیں"!

"جھوٹ کہتا ہے اگر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے"!

"قرآن سے جاہل ہیں جو انہیں مسلمان سمجھتے ہیں"!

یہ بہت بڑی جسارت ہے ——— کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم"! خدا معاف فرمائے!

اگر اس آسانی اور بے ساختگی اور روانی کے ساتھ کفر کے فتوے جاری ہو سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ سارے پاکستان میں، بلکہ عالم اسلام میں، مسلمان انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں!

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا گناہ ہے، لیکن اگر پابندی سے نماز نہ پڑھنے والا کافر نہیں ہے، تو حج نہ کر سکنے والے کو کافر کس طرح کہا جا سکتا ہے؟

بالآخر پاکستان بن گیا!

مسلمانانِ ہند نے ایک آزاد اور خود مختار ملک حاصل کر لیا؛

---

[1] خطبات، پندرھواں ایڈیشن، ص ۳۰۸

وہ اپنی قسمت اور مستقبل کے مالک بن گئے،
مولانا بھی پاکستان تشریف لے آئے۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

لیکن ——

لیکن ایک غیر مسلم ملک سے، ایک مسلم ملک میں آنے کے بعد بھی مولانا کا طرز و فکر نہیں بدلا، نہ ان کے اندازِ گفتگو میں کوئی فرق آیا،

ملاحظہ ہو:-

"بہرحال یہ فریب اور مسخراپن اب ختم ہونا چاہیے، جو آج لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے کہ اسلام پسند بھی نہیں ہے، اس کی پیروی پر راضی بھی نہیں ہیں۔ خیال و عمل میں اسے چھوڑ کر دوسرے طریقے اختیار بھی کر چکے ہیں، مگر اصرار ہے کہ ہم مسلمان ہیں، اور صرف مسلمان کہلائے جانے پر ہی مصر نہیں ہیں بلکہ اسلام کے علمبردار اور اس کے مفتی بھی بنے پھرتے ہیں، یہ کھیل بہت دنوں کھیلا جا چکا ہے' اب ہم اسے چلنے نہیں دیں گے!"[1]

.........!

پھر صرف اسی پر اکتفا نہیں ہوتا، ایک اور موقعہ پر کہیں زیادہ وضاحت اور صفائی کے ساتھ ارشاد فرمایا جاتا ہے:-

---

[1] جماعتِ اسلامی کا مطالبہ
(ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۸ء) ص ۱۴۵۰

ہم ہر شخص کے سامنے یہ سوال رکھتے ہیں اور اس کا دو ٹوک جواب چاہتے ہیں کہ تمہیں اسلام اپنے طرزِ زندگی کی حیثیت سے پسند ہے یا نہیں ؟

پسند نہیں ہے تو براہ کرم صاف انکار دو اور ملت کے دائرے سے باہر ہو جاؤ، پسند ہے، اور تم درحقیقت مسلمان رہنا چاہتے ہو تو سچے دل سے اسے قبول کرو، اسلام کے ایک جز یا چند اجزاء کو نہیں بلکہ پورے اسلام کو لو، سیدھی طرح اطاعت کا رویہ اختیار کرو اور اسلام کو اپنا دین مان لینے کے بعد کسی کو یہ کہنے کا حق رہتا ہی نہیں ہے کہ ہم اپنی عقل اور اپنی پسند کے مطابق جو طریقہ چاہیں گے اختیار کریں گے، اسلام اس آزادی کو آپ کا حق نہیں مانتا، !ل

.... !"

یہ لب و لہجہ نہ پیمبرانہ ہے، نہ مصلحانہ، نہ عالمانہ، نہ واعظانہ، یہ صرف ایک سیاست دان کے بول ہیں !

جس طرح پٹیل اور جواہر لال نہرو ہندوستان کے مسلمانوں سے کہتے تھے اگر تم ہمارے وفادار بن کر اس دیس میں نہیں رہ سکتے تو بوریہ بستر باندھو اور جدھر منہ اٹھے چلے جاؤ، اسی طرح مولانا مملکت اسلام کے شاہ ذی جاہ بن کر اعلان فرما رہے ہیں کہ یا تو ہمارے فرمودات کو گفتۂ اللہ مالو ورنہ ملتِ اسلامیہ کے دائرے سے باہر چلے جاؤ،

یہ فرمان خسروی یہیں ختم نہیں ہو جاتا، اس میں مزید فرمایا گیا ہے :-

---

ل جماعتِ اسلامی کا مطالبہ"
(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۴۸ء) ص ۱۴۵

"مسلمان ہونے کے بعد کسی کو یہ حق رہتا ہی نہیں کہ ہم اپنی عقل پسند کے مطابق جو طریقے چاہیں گے، اختیار کریں گے، اسلام اس آزادی کو آپ کا حق نہیں مانتا،"!

..........!"

ان چند سطروں میں مغالطے کے سوا کچھ نہیں ہے:

اسلام نہ عقل کا دشمن ہے، نہ انسان کے رجحان اور میلان پر پابندیاں عائد کرتا ہے"۔ اس نے خود بار بار "تعقل" اور "تفکر" کی دعوت دی ہے، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم اسلام قبول کرنے کے بعد عقل کو خیرباد کہہ دیں؟

اور یہ دعویٰ اسلام کے لیے صادق بھی کس طرح آسکتا ہے؟

دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی وہ تنہا اور اکیلا مذہب ہے، جو لوگوں کی عقل اور فکر سے اپیل کرتا ہے، بجا طور پر اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام میں کوئی بات عقل کے خلاف ہے ہی نہیں، اس صورت میں عقل اور اسلام کے مابین تفریق پیدا کرنے کی کوشش کرنا نہ مصلحت دین ہے نہ تقاضائے عقل و دانش۔

عملی طور پر ایک مسلمان میں خواہ کتنی ہی خامیاں ہوں لیکن فکری طور پر کوئی مسلمان بھی اسلام کو بالائے طاق رکھ کر اپنی ذاتی پسند اور ذاتی فہم کو نہ اسلام قرار دینے کا مدعی ہو سکتا ہے، نہ اس کا یہ دعویٰ مانا جا سکتا ہے۔

ایک مسلمان جو کچھ کہتا ہے وہ اپنی عقل کے مطابق اسلام کو پیش نظر رکھ کر کہتا ہے، اگر وہ اسلام کو پیش نظر رکھ کر عقل سے کام لیتا ہے تو بہت اچھا کرتا ہے اسلام اسے یہ حق دیتا ہے، اور بلاشبہ اسے یہ حق استعمال بھی کرنا چاہیے۔

اسلام کو پیش نظر رکھ کر عقل سے کام لینا عین تقاضائے اسلام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں عبد اور معبود، خالق اور مخلوق، بندے اور خدا کے

کے مابین وہ تیسرا واسطہ موجود نہیں ہے جسے "برہمنیت" یا "پاپائیت" کہا جاتا ہے، یہ تو دوسرے مذاہب کے ارباب من دون اللہ ہیں۔ جو انسان کی عقل کو مقید کر کے اپنے احکام چلاتے ہیں، اسلام میں ایسا کوئی طبقہ نہیں ہے، اور یہی اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور یہی خصوصیت اس مذہب کو ہمیشہ زندہ رکھے گی!

مسلم لیگ، پاکستان

اور سبک سارانِ ساحل

تنظیم ملّی کا "جُرم"

قصور ڈھونڈھ کے پیدا کیے جفا کے لیے!

○

مولانا نے اپنے مقالات و مضامین، اور ارشادات و فرمودات میں مسلم لیگ پر بھی وقتاً فوقتاً طبع آزمائی فرمائی ہے۔

آیئے ذرا مسلم لیگ کا آخری دور بھی ایک نظر دیکھتے چلیں،

مُسلم لیگ کا یہ وہی دور ہے جب مولانا نے اس کے خلاف پورے جوش و خروش کے ساتھ مورچہ قائم کیا تھا۔

تاریخ کا یہ بڑا عجیب زمانہ تھا!

مسلمان ازاں سو رانده وازیں سو درماندہ بنے ہوئے تھے۔

انگریزوں کی شہنشاہیت دم توڑ رہی تھی۔

ھندو سامراج اس اژدھے کی طرح نمودار ہو رہا تھا جس کی ہر پھنکار سے دور دور کے جاندار بے ساختہ اور بے تحاشہ کھنچے چلے آتے ہیں، اور اس کے منہ میں داخل ہو جاتے ہیں، اور اس کے جبڑوں کی ایک جنبش بے چاروں کی زندگی کو موت سے بدل دیتی ہے۔

مسلمانوں کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا،

وہ ہندو سامراج کے تسلط، اور ہندو اکثریت کے استیلاء سے خائف تھے۔ لیکن جانتے تھے انگریز جلد از جلد اس دیس سے رخصت ہو رہے ہیں، اور ان کے جانے کے بعد وہی جمہوری نظام کارفرما ہوگا جسے وہ چھوڑے جا رہے ہیں، اور اس جمہوری نظام میں اکثریت کے سامنے بہرحال اقلیت کو سر جھکانا پڑتا ہے، لہٰذا جو کام کل کرنا ہے وہ آج ہی کیوں نہ کیا جائے۔ جب ہندوؤں کی اکثریت اور بالادستی کے سامنے سر جھکانا ہی ٹھہرا تو انگریزوں کے چلے جانے کا انتظار کیوں کیا جائے؟ کیوں نہ انگریزوں کی موجودگی ہی میں یہ کارِ خیر انجام دے ڈالا جائے؟ وہ اسے سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ مسلمانوں کی جداگانہ مملکت قائم ہو سکتی ہے اور مسلمانانِ ہند کا اکثریتی علاقہ خود مختار ہو سکتا ہے، یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے علماء تک کانگریس کیمپ کو اپنا نشیمن بنائے ہوئے تھے۔

جو سرمایہ دار، خطاب یافتہ، زمیندار اور جاگیردار تھے وہ انگریزوں کو ظل اللہ سمجھ رہے تھے، اب تک اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ فرنگیوں کا آفتاب اقبال کبھی مائل بہ زوال نہیں ہو سکتا، ان کی حالت اس پودنے کی سی تھی جو اپنا سر ریت میں چھپا کر ٹانگیں اوپر اٹھا لیتا ہے اور یقین کر لیتا ہے اگر آسمان ٹوٹا تو اپنے پائے نازک پر روک لے گا۔

اس ابتری اور خلفشار کے باعث مسلمانوں میں کوئی تنظیم بھی باقی نہیں رہ

گئی تھی۔

یوں تو بہت سی سیاسی اور مذہبی جماعتیں تھیں، لیکن عملاً ان کا وجود اور عدم برابر تھا،

یہ شاندار اور تابناک ماضی رکھنے والی جماعتیں بدترین حال سے دوچار تھیں۔

ایک جمعیت علمائے ہند تھی!

اس جماعت کا عوام پر کوئی اثر نہیں تھا، جو کچھ تھا وہ صرف ایک مختصر سے طبقے تک محدود تھا۔

اور یہ اثر ——— جو کچھ اور جتنا کچھ بھی تھا ——— کانگریس کی تائید و نصرت میں صرف ہو رہا تھا،

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دل رُبا ادائیں!

ایک مجلس خلافت تھی۔

یہ وہ جماعت تھی جو ایک طوفان بن کر اٹھی تھی، اور سارے اسلامی ہند پر چھا گئی تھی۔ اس نے فرنگیوں کے قصرِ استعمار کے بلند و بالا کنگرے سرنگوں کر دیے تھے۔ اس نے مسلمانوں میں اسلام کے لیے مر مٹنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا، اس نے کانگرس کو ایک مضبوط، فعال، اور بین الملکی جماعت بنا دیا تھا، اس نے مسلمانوں کے گراں بہا اور ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے تھے، لیکن ——— یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا، اب تو مجلسِ خلافت ایک ٹوٹا ہوا مقبرہ تھی، اور اس مقبرے کا مجاور، ملت کا مخلص، فدا کار اور نہ تھکنے والا بوڑھا سپاہی شوکت علی تھا۔

لیکن تنہا اور بے یار و مددگار!

شوکت کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔

وہ اس بزم میں تنہا اور اکیلا تھا،

جن لوگوں کی شخصیت کی تعمیر اس کی رہین منت تھی، جن کا سیاسی مستقبل اس کی عالی ظرفی اور شفقت و مرحمت کا نتیجہ تھا جن کو اس نے فرش خاک سے عرش اعلیٰ پر پہونچا دیا تھا، جو کبھی اس کے دست و بازو تھے، وہ آج اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے اور بزم اغیار کی رونق تھے، اس پر فقرے چست کر رہے تھے، اور اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

شریکِ درد تو کیا باعثِ اذیت تھے!
وہ لوگ جن سے روابط تھے جسم و جاں کیطرح

!.....

ایک مسلم کانفرنس تھی۔

یہ کبھی عوامی جماعت نہ بن سکی، اس کی زندگی کا کارنامہ صرف چند تجاویز تھیں۔ کانگریس سے مایوس، لیکن انگریزوں سے پرامید یہ مسلمانوں کے کسی روگ کا مداوا نہ کر سکی۔ نہ ہندو اس سے خائف تھے، نہ انگریز متاثر۔

!.....

ایک مسلم نیشنلسٹ پارٹی تھی!

یہ جماعت ان مسلمانوں پر مشتمل تھی جو بغیر کسی ذہنی تحفظ کے مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دے رہے تھے۔ انہیں اپنے عوام میں کوئی رسوخ نہیں حاصل تھا، کانگریس کے ایوان میں ان کی پوچھ ضرور تھی، لیکن "شو بوائے" کی حیثیت سے انگریز انہیں کبھی خاطر میں نہیں لائے۔

ایک امارت شرعیہ تھی!

یہ جماعت قوم پرور علماء پر مشتمل تھی، عملاً جمعیۃ علمائے ہند کی ایک شاخ بے مثر، کانگرس میں اس کی کوئی خاص منزلت نہیں تھی اور انگریز اس سے واقف بھی نہیں تھے:۔

ایک مجلسِ احرار تھی!

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم!

ہو گئے خاک انتہا یہ ہے!

ایک زمانہ تھا کہ مجلسِ احرار کا طوطی بولتا تھا،

یہ ایک فعال، کارگزار، اور سراپا جہد عمل جماعت تھی

کشمیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے یہی جماعت تھی جو کفن سر سے باندھ کر میدان میں اتری تھی، اس نے ڈوگرہ راج کے چھکے چھڑا دیے تھے؛ اس نے ہندو سامراج کا ایوان متزلزل کر دیا تھا، اس نے انگریزوں کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

لیکن کچھ عرصے بعد کانگریس نے اسے اسیرِ دام کر لیا اور یہ مسلمانوں کے اعتماد سے محروم ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ:۔

واعظِ قوم کی وہ شعلہ مقالی نہ رہی

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی!

.....!

ایک جماعت خاکسار تھی!

ایک زمانے میں اس جماعت کا وہ دم خم تھا کہ انگریز بھی اس سے خائف تھے اور ہندو بھی سراسیمہ، یہ پہلی جماعت تھی جس نے مسلمانوں میں شاندار طور پر فوجی اسپرٹ پیدا کی۔

لیکن اس کے سامنے کوئی واضح لصب العین نہیں تھا، کوئی متعین مقصد

نہیں تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ہندوؤں اور انگریزوں سے قطع نظر کر کے خود مسلمان کے خلاف بزن بول دیا، یہ جماعت اٹھی اس لیے تھی کہ مسلمانوں کی تنظیم کرے، لیکن کیا یہ کہ مسلمانوں میں اختلاف و افتراق باہمی کی خلیج زیادہ سے زیادہ وسیع کر دی، یہ مسلمانوں سے لڑی، لیکن مسلمانوں کے لیے کسی قوم یا طاقت سے جنگ نہ کر سکی، رفتہ رفتہ یہ بھی بے اثر ہوتی چلی گئی،

ان حالات میں ہندوؤں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مسلمانوں میں کوئی دم نہیں ہے، نہ وہ سیاسی تنظیم سے بہرہ ور ہیں نہ سیاسی شعور سے، نہ ان کے پاس کوئی مرکز ہے، نہ متفقہ اور محبوب عوام زعیم، ان کی حیثیت بھی وہی ہے جو ہندوستان کی دوسری اقلیتوں کی ہے، اور اگر کچھ لوگ "علمی" طور پر مسلمانوں کی انفرادیت کا نعرہ بلند بھی کرتے ہیں تو وہ صدا بہ صحرا سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا،

انگریز بھی مطمئن تھے کہ جس جمہوریت کی انہوں نے داغ بیل ڈالی تھی اسے فروغ دے کر جب چاہیں گے رختِ سفر باندھ کر اپنے ملک واپس چلے جائیں گے، انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر دوستی کرنی ہے تو صرف ہندوؤں سے کرنی چاہیے۔ سودا کرنا چاہیے تو صرف ہندوؤں سے، سمجھوتہ کرنا چاہیے تو اکیلے ہندوؤں سے، ہندو ہی اس دیس کے مالک ہیں، وہی اس ملک کی نمائندگی کا حق رکھتے ہیں اور وہی منطقی طور پر اس ملک کے آئندہ حکمران ہوں گے،

یہ حالات تھے جب مسلم لیگ ——— جو ایک عرصۂ دراز سے اب تک خود بھی مردہ چلی آ رہی تھی ——— تجدید حیات سے بہرہ ور ہو کر نمودار ہوئی، اس نے ہندو سامراج کو بھی للکارا اور فرنگی استعمار کو بھی چیلنج کیا، اور اپنی قوم میں بھی بیداری کا صور پھونکا، اسے بتایا، سمجھایا اور باور کرایا کہ اگر تم اب بھی نہ جاگے اب

کبھی مست خواب خرگوش رہے، تو ——— تو تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی،
داستانوں میں!

مسلم لیگ نے مختصر ترین مدت میں مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی پیدا کر دی، ان میں سیاسی شعور پیدا کر دیا، ان میں ضبط و نظم کی روح بیدار کی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے لیے ایک نصب العین، ایک مقصد، ایک منہاج اور ایک منزل مقصود متعین کر دی۔

وہی مسلمان جو "لامرکزیت" کا شکار تھے، جن کے پاس کوئی متفقہ اور متحدہ زعیم نہیں تھا، جنہیں نہ ہندو خاطر میں لاتے تھے نہ انگریز جن کے پرواہ کرتے تھے دفعتہً ایک زندہ، منظم اور ناقابل تسخیر قوم بن گئے۔

یہ ایسی گھڑی تھی کہ جس کے دل میں مسلمانوں کا، اور اسلام کا ذرا سا درد بھی تھا اور مسلمانوں کی صلاح و فلاح کو عزیز و محبوب رکھتا تھا مسلم لیگ کی صدائے اتحاد پر لبیک کہتا اور پکار اٹھتا:۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا؟
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے؟

مسلم لیگ کی پکار، ہر مسلمان کی آواز بن جانی چاہیے تھی۔

یہ وقت تھا کہ مسلم لیگ کی آواز سن کر جو بیٹھا تھا وہ کھڑا ہو جاتا، جو کھڑا تھا، وہ چلنے لگتا اور جو چل رہا تھا، وہ دوڑنے لگتا۔

یہ فیصلہ کن مرحلہ تھا!

امتحان کی گھڑی تھی یہ!

اس جنگ میں اگر مسلمان ہار جاتے تو پھر وہ کبھی نہ جیت سکتے تھے!

اس جنگ میں ہارنے کے بعد وہ زندہ رہنے کا حق کھو دیتے اور اگر جیت جاتے تو جس طرح چاہتے اپنی زندگی کا سانچہ ڈھال سکتے تھے

وہ مسلمان جو کانگریس کے ساتھ تھے اور مسلم لیگ پر سب و شتم کے تیر برسا رہے تھے، بہر حال ایک پالیسی رکھتے تھے: خواہ ہمارے نقطۂ نظر سے وہ کتنی ہی مہلک کیوں نہ ہو۔

وہ لوگ جو انگریزوں کا ساتھ دینا ہی موجب اجر اخروی خیال کرتے تھے، بہر حال ایک متعین نصب العین رکھتے تھے، خواہ وہ اسلامی اور ملی نقطۂ نظر سے کتنا ہی غلط اور افسوس ناک کیوں نہ ہو۔

لیکن ان لوگوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو فرنگی استعمار کے بھی مخالف تھے۔ اور ہندو سامراج کے بھی ——— اور مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کے بھی ——— اور اس حقیقت سے مولانا کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اسی آخری جماعت کے قافلہ سالار تھے۔

مولانا نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

"آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس مسلم لیگ، جس کو کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے، ذرا اس کو دیکھیے کہ اس وقت وہ کس روش پر چل رہی ہے ——— جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی، وہ اصول پرستی کے ہر نشان سے خالی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے تو اس کے آئینہ میں ہر صاحب نظر آدمی دیکھ سکتا ہے ——— کہ ان نام نہاد مسلمانوں پر پوری طرح اخلاق کی موت وارد ہو چکی

ہے!"[1]

.....!

اور مسلم لیگ کی روش اس کے سوا کیا تھی کہ وہ مسلمانوں کو نہ ہندوؤں کو لقمۂ تر بنانا چاہتی تھی، نہ انگریزوں کی غلامی میں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ ان کے لیے ایک آزاد اور خود مختار وطن کا مطالبہ کر رہی تھی، اگر یہ روش "اصول پرستی کے ہر نشان سے خالی" تھی، تو جواب میں اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے!

آگے چل کر مزید ارشاد ہوتا ہے:۔

"میں اس معاملے کو ہندوستانی وطن پرست کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے بھی بحث نہیں کہ سیاسی حیثیت سے مسلم لیگ کی یہ پالیسی اس مسلمان قوم کے لیے جو ہندوستان میں بستی ہے، مفید ہوگی یا مضر؟

میرے لیے جو سوال اہمیت رکھتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ قوم اس وقت مسلمان قوم کے نام سے پکارے جانے کے باعث دنیا میں اسلام کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی مجلس نے دنیا کے سامنے کس رنگ میں اسلام کو پیش کیا ہے؟ اس نقطۂ نظر سے جب میں مسلم لیگ کے ریزولیوشن کو دیکھتا ہوں تو میری روح بھی

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصۂ سوم، ص ۲۹۔

بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے"![1]

.....!

مولانا کا نقطۂ نظر نہ ایک "وطن پرست" کا نقطۂ نظر ہے، نہ "ایک قوم پرور" کا، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہر بات کو دیکھتے ہیں اور خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اگر حالات کا جائزہ لیا جائے تو صرف وہی مسلک قویم اور سدید نظر آئے گا جو مسلم لیگ کا تھا، یعنی مسلمانوں کے لیے ایک آزاد وطن کا مطالبہ، جہاں نہ ہندوؤں کی بالادستی ہو، نہ انگریزوں کا احتساب!

اور اگر اس کے علاوہ مسلمانوں کی فلاح کا کوئی اور راستہ تھا تو مولانا کو چاہیے تھا کہ دوسروں پر تنقید کرنے کے بجائے خود میدانِ عمل میں نزول فرماتے اور بتاتے کہ اے مسلمانو، نہ انگریزوں کا ساتھ دو، نہ ہندوؤں کا، نہ مسلم لیگ کا، میرے ساتھ آؤ، میں تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچاؤں گا، لیکن کیا وہ منزلِ مقصود پاکستان کے سوا کوئی اور بھی ہو سکتی تھی؟ اور اگر ہو سکتی تھی تو وہ کہاں تھی؟

حکومت الٰہیہ خواہ آج قائم ہو، خواہ پچاس برس کے بعد، اگر قائم ہو سکتی ہے تو صرف پاکستان میں، ہندوستان میں یا کسی غیر مسلم اکثریت رکھنے والے ملک میں اس کا قیام خارج از بحث ہے۔

تو درونِ در چہ کردی کہ بروں خانہ آئی؟

جو لوگ اپنے گھر میں حکومت الٰہیہ نہیں قائم کر سکتے وہ باہر کیا کریں گے۔

ایک اور موقع پر اسی موضوع سے متعلق ارشاد فرمایا ہے:۔

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم، ص ۳۰۔

"ان تجربات کے بعد اب ضروری ہے کہ ہم اپنی دوسری پالیسی پر بھی نظرِ ثانی کریں ـــ!

.......!

پہلی پالیسی تقریباً سو برس کے تجربے سے غلط ثابت ہوئی، اور اسے بدلنا پڑا۔ دوسری پالیسی کو ستر (۷۰) برس کے تجربے نے غلط اور غلط ہی نہیں بلکہ مہلک ثابت کر دیا۔ اس کو بھی بدلنا اور بہت جلد بدل ڈالنا چاہیے۔ اب ہمارے لیے صرف تیسری پالیسی باقی رہ جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ:۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

جو ڈھانچہ تمہارے گرد و پیش چھا گیا ہے، اس سے تم الگ بھی نہیں رہ سکتے، اور اس میں اپنی خودی قربان کیے بغیر ٹھیک نہیں بیٹھ سکتے لہٰذا آؤ! اب مردوں کی طرح لڑ کر اس ڈھانچے کو توڑ ڈالو، اور اسے مجبور کر دو کہ تمہاری ہیئت کے مطابق بنے۔

ـــ !له

.......!

لیکن مولانا نے یہ نئی بات نہیں کہی، یہ وہی بات ہے جو مسلم لیگ کہہ رہی تھی۔ مسلم لیگ نے زمانے کی ناسازگاری سے مفاہمت نہیں کی، جنگ کی اور مردانہ وار جنگ کی۔ اور اس وقت تک یہ جنگ جاری رکھی جب تک اس نے اپنی نئی دنیا نہیں بنالی،

له مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ دوم ص ۸

مسلم لیگ کے بارے میں، اس کی کارکردگی کے بارے میں، اس کے مقصد اور منہاج کے بارے میں، مولانا ایک غیر اسلامی حرکت یعنی پیش گوئی سے بھی باز نہیں آتے، چنانچہ ارشاد فرمایا جاتا ہے:۔

"جنت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں، لیکن آزاد پاکستان ۔۔۔۔ اگر فی الواقع بنا بھی تو ۔۔۔۔ لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا، جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک ہوں گے جس طرح مسلمان اور پاکستان میں ان کی تعداد اتنی کم اور نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہو گی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنا سکے۔"[1]

.....!

حالانکہ جب مولانا یہ فرما رہے تھے، اسی زمانے میں قائدِ اعظم بھی وضاحت اور صراحت کے ساتھ نہ صرف مسلمانوں کو، دوستوں کو، دشمنوں کو بلکہ ساری دنیا کو یہ بانگ دہل بتا رہے تھے اور منادی کر رہے تھے کہ:۔

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں، اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ پارلیمان کی، نہ کسی شخص اور ادارہ کی قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور

---

[1] ترجمان القرآن، فروری ۱۹۴۶ء ص ۱۵۴، ۱۵۵

پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں، اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کے لیے، آپ کو لامحالہ علاقے اور مملکت کی ضرورت ہے"! [1]

.........!

ایک اور موقع پر قائد اعظم نے فرمایا :-

"پاکستان کا قیام جس کے لیے گزشتہ دس سال سے ہم مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے،

لیکن ہمارے لیے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا،

ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت قائم کرنے کے مواقع میسر ہوں، جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی تہذیب اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور جہاں اسلام کے عدل عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔! [2]

.........!

اسی طرح قائد اعظم نے یہ بھی فرمایا تھا :-

"مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس لیے کرتے ہیں کہ اس میں وہ اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی نشوونما روایات، اور اسلامی قانون

---

[1] قائد اعظم کی تقریر "پاکستان" ۱۹۴۶ء

[2] تقریر کراچی، اکتوبر ۱۹۴۷ء۔

کے مطابق زندگی بسر کر سکیں،"[۱]

.........!

نہ صرف یہ بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ ———— قائداعظم نے واشگاف الفاظ میں ارشاد فرمایا:-

"پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں، اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے، ہمیں صرف آزادی ہی نہیں حاصل کرنی ہے، اس قابل بھی بننا ہے کہ اس کی حفاظت کر سکیں، اور اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔"[۲]

.........!

کیا اس موضوع پر مولانا نے اب تک جو کچھ فرمایا ہے وہ قائداعظم سے کچھ زیادہ ہے....؟

جب تک پاکستان نہیں بنا تھا،

جب پاکستان کی لڑائی لڑی جارہی تھی،

ہندوؤں اور انگریزوں سے جب مسلم لیگ پاکستان کے لیے برسرِپیکار تھی،

اور جب پاکستان بن گیا،

جسے خوابِ بے تعبیر کہا جاتا تھا۔ اس نے حقیقت اور واقعہ کی صورت اختیار

---

[۱] تقریر، ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء

[۲] تقریر جون ۱۹۴۵ء

کرلی، تو جماعتِ اسلامی کا مسلک بدل گیا، وہ نہ صرف اپنے کارواں سالار کے ساتھ پاکستان میں آگئی، بلکہ اس نئے ملک کی قیادت کا بارِ گراں بھی اپنے دوشِ ناتواں پر لینے کو تیار ہوگئی:۔

"دس برس کے بعد آج اس کا (مسلم لیگ کا) پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح کس صورت میں ہمارے مسئلے کو حل کیا؟ جو کچھ ہو چکا وہ تو امر مٹ ہے، اب اسے بدلا نہیں جا سکتا، اس پر اس حیثیت سے بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا؟ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں، کیا ان کے حل کے لیے بھی وہی قیادت موزوں ہے۔ جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلے کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آپڑے ہیں، جن کا بیشتر حصہ خود اس قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، انہیں حل کرنے کے لیے ہم اس پر اعتماد کریں؟[1]

!.....

جن لوگوں کو پاکستان سے نہ صرف کوئی سروکار نہ تھا بلکہ اسے ناممکن العمل اور غلط سمجھتے تھے اب وہ پاکستان کے مالہ و ماعلیہ پر لب کشائی بھی کرنے لگے،۔

میرے تغیرِ رنگ پر مت جا
انقلابات ہیں زمانے کے!

---

[1] ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۴۸ء ص ۱۳۸

ارشاد ہوتا ہے:۔

"آج ایک سال کے بعد کہا جا رہا ہے کہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی زبردستی سے کیا تھا اور ہم اس پر راضی نہ تھے"۔

مگر سوال یہ ہے کہ جب یہ زیادتی کی جا رہی تھی اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن ہماری بربادی کے کیا سامان کر رہا ہے، اس وقت آپ کی زبان کہاں چلی گئی تھی؟

کیوں نہیں، آپ نے اپنی قوم کو، اور ساری دنیا کو اس شرارت کی خبر دی؟ کیوں آپ خاموشی کے ساتھ وہ سب کچھ قبول کرتے گئے جو مسلمانوں کے لیے سخت تباہ کن تھا۔ کیوں اس وقت آپ نے یہ اعلان نہ کیا کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن اپنی ذمہ داری پر کر رہا ہے، اور ہم بہ رضا و رغبت اس کی ذمہ داری میں شریک نہیں ہیں۔

صرف یہی نہیں کہ اس وقت آپ خاموش رہے، بعد میں جب اس مسلط طرز تقسیم کے سخت ہولناک نتائج رونما ہو گئے، اور لاکھوں مسلمانوں کو اس کا بدترین خمیازہ بھگتنا پڑا، اس وقت بھی آپ نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی...![1]

.....!

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ترک تازیوں، حیلہ جوئیوں، اور شرارتوں کے سدباب کے لیے مسلم لیگ نے کچھ نہ کر سکنے کے باوجود بہت کچھ کیا، جو کچھ کیا اس کی تفصیل بغیر کسی زحمت کے کیمبل جانسن کی کتاب "مشن لارڈ ماؤنٹ بیٹن" مولانا ابوالکلام آزاد کی

---

[1] ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۴۸ء، ص ۱۳۷

کتاب "انڈیا ونس فری ڈم" میں، اور دی پی مینن کی کتاب "ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ لیکن مولانا کی معصومیت کی یہ انتہا ہے کہ وہ ان جملہ حقائق سے بے خبر ہیں"۔

معاملہ صرف یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا،

مسلم لیگ کا ایک ناقابلِ بخشش گناہ یہ بھی ہے کہ اس نے تقسیم ہند منظور کر کے مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہونچایا، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"یوں اس تحریک میں اسلام سے وہ خدمت لی گئی جو بگڑے ہوئے نوابزادے اپنے خاندان کے کسی پرانے جاں نثار ملازم سے لیا کرتے ہیں۔ مشورہ اور نصیحت اس کا کام نہیں ہوتا۔ یہاں لوگ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں۔ مگر آڑے وقت میں بوڑھے خادم کو پکارا جاتا ہے کہ آؤ اور حق نمک ادا کرو، پھر اگر وہ غریب ان حرکات پر صبر نہیں کر سکتا، جن کی وجہ سے برے وقت آتے ہیں، اور بے چین ہو کر کبھی کہہ بیٹھتا ہے کہ صاحب زادے اپنے اطوار ٹھیک کرو، تو اسے ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ "ایاز قدرِ خود بشناس"! تو اپنے کام سے کام رکھ، تیری یہ حیثیت کب سے ہو گئی کہ ہمارے کام میں دخل دے؟

یہ تھیں وہ بنیادی باتیں جن پر ہماری یہ قومی تحریک اول دن سے اٹھی، اور آخر تک بڑھتی چلی گئی، اس کے اجزائے ترکیبی میں مومن اور منافق، اور کھلے کھلے ملحد سب شامل تھے، بلکہ دین میں جو جتنا ہلکا تھا وہ اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی"[1]

---

[1] ترجمان القرآن جولائی ۱۹۴۸ء، ص ۱۳۲۔

کس بے تکلفی سے اور کتنے بے محابا طور پر، مولانا مسلم لیگ کے ان کارکنوں کو جنہوں نے اسلام ہی کے حفظ و بقا کے لیے، پاکستان کی لڑائی لڑی تھی، صلواتیں سناتے ہیں، کبھی ایک نوابزادے اور "پرانے جال نتار ملازم" کی فرضی مثال پیش کر کے اسلام تک کے حق میں سوء ادب کا ارتکاب کر جاتے ہیں، کبھی لیگ کے اجزائے ترکیبی میں سے جنوں کو چاہتے ہیں تخصیص و تعیین کے بغیر منافق اور ملحد قرار دیتے ہیں، حالانکہ از روئے اسلام یہ الفاظ اس وقت تک کسی کے لیے نہ استعمال کرنے چاہئیں جب تک حق الیقین نہ ہو بلکہ اس کے بعد بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سکوت کو ترجیح دی جائے۔

مولانا "مزاج شناس رسولؐ" بھی ہیں، کیا وہ نہیں جانتے کہ ایک دعوت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو موجود نہ پایا تو استفسار فرمایا، وہ کیوں یہاں نہیں آیا؟

صحابہ میں سے ایک نے کہا:۔

"وہ شراب پیتا ہے اور منافق ہے!"

اور یہ واقعہ ہے کہ شخص مذکور پر شراب نوشی کے الزام میں حد (سزا) بھی ایک سے زائد بار جاری ہو چکی ہے۔ مگر آپؐ کو یہ بات ناگوار گزری:

آپؐ نے فرمایا:۔

"اسے منافق نہ کہو، میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ سے اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے!"

ایک شخص جو شراب نوشی کا مجرم ہے، جس پر حد جاری ہو چکی ہے، آپ اس کے ایمان کی توثیق فرماتے ہیں لیکن جن مسلمانوں کے بارے میں مولانا کا کوئی ذاتی مشاہدہ نہیں ہے، انہیں وہ بے تکلف ملحد اور منافق فرما دیتے ہیں، کیا ایک مزاج

شناس رسولؐ کو اتنا ہی غیر محتاط ہونا چاہیے ۔۔؟

اس کے بعد مولانا نے ارشاداتِ عالیہ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا ہے :۔

"یہ تو تھا ہماری اس عظیم الشان قومی تحریک کا اخلاقی و دینی پسِ منظر، اب ذرا اس کے اصل کام کا جائزہ لیجیے جو وہ قوم کو بچانے کے لیے کر رہی تھی ۔

مسلمانوں کا قومی مطالبہ جو اس نے مرتب کیا یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عددی اکثریت کے لحاظ سے ملک تقسیم کر دیا جائے ۔

اس مطالبے کے اندر آپ سے آپ تین باتیں شامل تھیں، ایک یہ کہ لقمۂ تر بنا آدھے مسلمان ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جائیں گے ۔

دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی قومی ریاست دو ایسے چھوٹے چھوٹے خطوں میں بنے جن کی حیثیت ہندو ریاستوں کی سرحد پر قریب قریب وہی ہو جو پولینڈ اور چیکوسلواکیہ جیسی ریاستوں کی حیثیت روس کی سرحدوں پر ہے ۔

تیسرے یہ کہ ان دونوں خطوں کے درمیان بھی ایک ہزار میل کا ہندو علاقہ حائل ہو، اور ان کے درمیان نہ حالتِ امن میں پوری طرح تعاون ہو سکے نہ حالتِ جنگ میں یہ ایک دوسرے کی مدد حاصل کر سکیں ۔"[1]

[1] ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۴۸ء ص ۱۳۳

.........!

ان اشکالات کے پیش کرنے کا مقصد اور مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ پاکستان کو نہ بننا چاہیے تھا؛

پاکستان میں رونق افروز ہو کر مولانا کا اس طرح کی باتیں کرنا اور حکمران جماعت (مسلم لیگ) کا چپ چپاتے انہیں برداشت کر لینا اپنی اپنی جگہ پہ عالی ظرفی کی انتہا ہے۔

مولانا کو تحریک پاکستان کے زمانے میں بھی اس پر بہت سے اعتراضات تھے، اور جب یہ تحریک اپنے مقصد سے ہم کنار ہو گئی، تب بھی ان کے ایرادات و اعتراضات کا سلسلہ جاری رہا؛

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"یہ تحریک (پاکستان کی تحریک) ایک قومی تحریک تھی، اس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے جو نام ونسب کے اعتبار سے مسلم قوم کے افراد تھے۔ یہ سوال اس میں سرے سے بے محل تھا کہ جو اس میں شریک ہوتا ہے وہ خدا، رسول، آخرت، وحی، کتاب اور دین (شریعت کو مانتا ہے یا نہیں؟ اور فجور و تقویٰ، دین داری اور بے دینی کی مختلف صفات میں کس صفت کے ساتھ متصف ہے؛

اصل مسئلہ قوم کو بچانے کا تھا، اور اس کے لیے قوم کے تمام عناصر کا متحدہ محاذ بننا ضروری تھا، پھر جو کام پیش نظر تھا، وہ بھی فتویٰ اور امامت کا تھا کہ دین و اعتقاد اور حرام و حلال کی تمیز کا قائل ہونے کے تجسّس کی ضرورت پیش آتی، مقصود صرف قومی مدافعت تھی۔

اور اس کے لیے تحریک کی شرکت تو درکنار اس کی قیادت و رہنمائی کے معاملے میں بھی یہ دیکھنے کی حاجت نہ تھی کہ جن لوگوں کو ہم آگے لا رہے ہیں، ان کا اسلام سے کیسا اور کتنا تعلق ہے؟۔

.....!

یہ تحریک سیاسی تھی، اس میں اخلاق کا بھی کوئی سوال نہ تھا، جس نے سیاسی جوڑ توڑ میں جتنی زیادہ مہارت دکھائی وہ اتنی ہی زیادہ ذمہ داری کے منصب کا اہل قرار پایا![1]

.....!

ان ارشادات سے ثابت ہوا کہ کسی تحریک کا "سیاسی" اور "قومی" ہونا دین کے خلاف ہے۔

حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے۔

"خلافت" بھی قومی اور سیاسی تحریک تھی، لیکن مذہبی بھی تھی۔

اسی طرح پاکستان کی تحریک اگرچہ قومی اور سیاسی تھی لیکن خالص مذہبی بھی تھی، اس لیے کہ اس کا مقصد بالآخر قرآن کی حکومت قائم کرنا، اور اسلام کے نظام کو بروئے کار لانا تھا، جیسا کہ قائداعظم نے پاکستان بننے کے بعد فرمایا بھی تھا:۔

"ہمارے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ یہاں کے عوام خوش حالی اور اطمینان کی زندگی بسر کریں، اس مقصد کا حصول مغرب کے اقتصادی نظام کو اختیار کرنے سے کبھی نہیں ہو سکتا۔

ہمیں اپنا راستہ آپ متعین کرنا چاہیے، اور دنیا کے سامنے ایک

---

[1] ترجمان القرآن، جولائی، ۱۹۴۸ء، ص ۱۳۱

ایسا نظام پیش کرنا چاہیے، جو انسانی مساوات اور عدل عمرانی کے اسلامی تصورات پر مبنی ہو، صرف یہی وہ طریقہ ہے جس سے اس اہم فریضہ سے ہم عہدہ برآ ہوسکیں گے جو ہم پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے، اور ہم دنیا کو وہ پیغام دے سکیں گے جو اسے تباہیوں سے بچالے گا، اور نوع انسان کی بہبود و مسرت اور خوشحالی کا ضامن ہوسکے گا، یہ کام کسی اور نظام سے نہیں ہوسکتا! [۱]

.........!

غرض مسلم لیگ کے بارے میں مولانا کے فرمودات حقیقت سے اتنا تعلق نہیں رکھتے جتنا بدگمانی سے، حالانکہ ممکن نہیں کہ صاحبِ "تفہیم القرآن" کی نظر بارہا، اس آیت کریمہ پر نہ پڑچکی ہو"، :-

لا یجرمنکم شنآن قوم، الا تعدلوا، اعدلوا، ھواقرب للتقوٰی، ! [۲]

مسلم لیگ اور پاکستان ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں، جیسے ناخن سے گوشت، ان دونوں کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔

جماعتِ اسلامی کی طرف سے یا مولانا کی طرف سے، مسلم لیگ پر جب عتاب

---

[۱] تقریر جولائی ۱۹۴۷ء

[۲] یعنی کسی قوم یا جماعت کی دشمنی تمہیں (اس کے بارے میں) راہ اعتدال سے منحرف نہ کردے، (ہمیشہ) عدل سے کام لو، کہ تقوٰی سے قریب تر یہی ہے۔

نازل ہوتا ہے، تو درحقیقت پاکستان کا تصور معتوب ہوتا ہے، اور اگر پاکستان مورد قہر و غضب ہوتا ہے تو حقیقتاً مسلم لیگ مقہور قرار پاتی ہے "

مُسلم لیگ یا پاکستان، یا دونوں سے مولانا حد درجہ بیزار ہیں ۔

اور پاکستان بن چکنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کی قائم کی ہوئی جماعت اسلامی نہ صرف پاکستان میں نمودار ہوتی ہے ۔ بلکہ اس ملک کی سیاست میں نظری اور عملی حصہ بھی لیتی ہے، اور اس کی قیادت حاصل کرنے کے لیے سعی پیہم سے کام بھی لیتی ہے :-

" ہم دراصل ایک گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں، جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں، اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت و صلاحیت بھی عام دنیا داروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو! [۱]

......!

لیکن اس کے بعد پھر اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے :-

" زندگی کا نظام جو آج باطل پرستوں اور فساق و فجار کی رہنمائی اور قیادت و فرماں روائی میں چل رہا ہے، اور معاملاتِ دنیا کی زمام کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، ہم دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے، اور رہنمائی و امامت نظری اور عملی دونوں ہی حیثیتوں سے مومنین و صالحین کے ہاتھ میں منتقل ہو۔

---

[۱] دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات" ص ۵۲

.....!

اور اس کے بعد فرمایا جاتا ہے:-

"اب آپ خود سمجھ لیں کہ نظامِ باطل کے تسلط کو برداشت کرنا بھی جب کہ تقاضائے ایمان کے خلاف ہو تو اس پر راضی اور مطمئن رہنا، اور اس کے قیام و بقا کی سعی میں حصہ لینا، یا ایک نظامِ باطل کو سرفراز کرنے کی کوشش کرنا، ایمان کے ساتھ کیسے میل کھا سکتا ہے[1]؟"

.....!

ان تینوں اقتباسات سے جو اوپر پیش کیے گئے، نتیجہ کیا نکلا؟

یہ کہ:

"درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق" کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے،

یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آگے چل کر جو کچھ ارشاد ہوا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان میں زندگی کا نظام جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے، یہ وہ لوگ ہیں،

جو ——

۱ : باطل پرست ہیں،

۲ : فاسق ہیں۔

۳ : فاجر ہیں

۴ : خدا کے باغی ہیں۔

یہ خطابات دیے بغیر بھی مولانا اپنا مدعا بیان کر سکتے تھے!

---

[1] دعوتِ اسلام اور اس کے مطالبات، ص ۲۰

جن لوگوں کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، کیا وہ واقعی اسی طرزِ خطاب کے سزاوار تھے۔

کیا پیمبرانہ دعوت کے الفاظ ایسے ہی ہوتے ہیں؟

سب وشتم کے بغیر کیا دعوت و تبلیغ، اور تلقین و موعظت کا فریضہ انجام نہیں دیا جاسکتا؟

ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد ہوتا ہے :-

"غور کیجیے اتنی بڑی قربانی آپ کی قوم نے کس مقصد کے لیے دی ہے؟ کیا محض اس لیے کہ اس ملک میں ایک چھوٹی سی ریاست مسلمانوں کی بھی قائم ہو جائے؟ ویسی ہی ریاست جس طرح افغانستان میں افغانیوں کی ایران میں ایرانیوں کی، اور ٹرکی میں ترکوں کی ہے؟

اگر فی الواقع یہی چیز پیش نظر تھی تو میں عرض کروں گا کہ بڑی ہی حقیر چیز کے لیے مسلمان قوم نے اپنی بہت بڑی چیز قربان کی، اور یہ ساری قربانی خسر الدنیا والآخرۃ کی مصداق ہے"! [1]

.....!

افغانستان میں افغانیوں کی، ایران میں ایرانیوں کی اور ترکیہ میں ترکوں کی جو حکومت قائم ہے وہ "اسلامی" نہ سہی لیکن اسلام کے نام لیواؤں کی تو ہے ——— کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی!

---

[1] ترجمان القرآن، جون ۱۹۴۹ء ص ۱۴۱ -

اس منزل کے بعد دوسری منزل خالص اسلامی حکومت کی بھی آسکتی ہے۔
اور جس قدر جلد اسلامی شعور مسلم عوام میں پیدا ہوگا، اتنی ہی تیزی کے ساتھ یہ دوسری منزل قریب آسکتی ہے۔

لیکن وہ منزل خواہ کتنی ہی دیر میں آئے، موجودہ منزل بہرحال اس منزل سے جو غیر مسلموں کے استیلاء اور تسلط کی حامل تھی، بہتر ہے، لہٰذا اس ابتدائی قدم کی مخالفت کس اصول اور منطق کی رو سے روا ہو سکتی ہے؟

جس طرح عمل کی دنیا میں اعتدال انتہا پسندی کی بہ نسبت بہتر ہوتا ہے اسی طرح فکر و نظر کی دنیا میں بھی اعتدال کو انتہا پسندی پر ترجیح حاصل ہے!

"وہ اس فسادِ عظیم (فسادات بعد از تقسیم ہند) کی بحث کو باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔

وہ اس کی ایک شاعرانہ توجیہہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ کشت و خون اور ظلم و ستم کا یہ مظاہرہ کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس پر کچھ فکرمند ہونے کی ضرورت ہو، یہ تو ایک آزاد قوم کی ولادت کے درد ہیں۔ جو ایسے مواقع پر ہوا ہی کرتے ہیں۔

حالانکہ اگر یہ ولادت کے درد ہی تھے تو یہ دنیا کو ایک درندے کی پیدائش کی خوشخبری دے رہے تھے نہ کہ ایک انسان کے تولد کی۔[1]

!.........

---

[1] ترجمان القرآن ۱۹۴۸ء ص ۵۹۔

کیا اس کڑواہٹ میں سچائی کا شمہ بھی ہے ؟

کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ قوموں اور ملتوں کو آزادی خون کے سمندر میں غوطے لگانے کے بعد ہی ملتی ہے ؟

دنیا کی دوسری قوموں اور ملتوں کی تاریخ ملاحظہ فرمائیے، اس طرح کے واقعات روح فرسا، اور لرزہ خیز حد تک بکثرت اور قدم قدم پر نظر آئیں گے۔

ہم نے بھی آزادی چھینی ہے، ہمیں بھی خون کے سمندر سے گزرنا پڑا۔

اگر ہم اس سمندر سے نہ گزرتے تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے تھے کہ پٹھان کورٹ یا کسی اور شہر میں بیٹھے آزادیٔ تحریر کا مظاہرہ کر رہے ہوتے، لیکن کیا اسطرح کبھی کوئی قوم آزاد ہوئی ہے ؟

امریکہ کی تاریخ حریت کا مطالعہ فرمائیے، آئرلینڈ کی جنگ استقلال کا نظارہ کیجیے، مراقش، تیونس، الجزائر، مصر، اور دوسرے ملکوں کی تاریخ جہد استقلال پر ایک نظر ڈالیے، کیا خون کے ابلتے ہوئے فواروں کے سوا کچھ اور نظر آئے گا؟ آزادی خوانِ نعمت میں تحفے اور سوغات کے طور پر رکھ کر نذر نہیں کی جاتی، اس کے لیے گردنیں کٹانا پڑتی ہیں، سینے چھدوانا پڑتے ہیں، خون میں نہانا پڑتا ہے ——
یہ سب کچھ ہم نے بھی کیا اور ہم قطعاً اس پر شرمندہ نہیں ہیں، بلکہ نازاں اور مفتخر ہیں۔

—— شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم،

پاکستان اور مسلم لیگ سے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر ایک مصلح کے بجائے ایک حریف کا ہے، اور حریف بھی وہ جو دور سے بیٹھا چیلنج دیتا رہتا ہے۔ سامنے نہیں آتا،

جب پاکستان بن رہا تھا، جب پاکستان بن گیا، جماعت اسلامی اور مولانا کا کردار مور چیلنج کے سوا کیا ہے ؟ —— یقیناً کچھ نہیں !

قائداعظم

○

قومیت، ملیت، اسلامیت

قیادتِ عظمیٰ

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

○

گذشتہ ایک صدی میں مسلمانوں پر تین نازک ترین دور آئے، اور ہر مرتبہ ——

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند! کا معاملہ پیش آیا،

ان ہر سہ ادوار کی مختصر تفصیل یہ ہے:

---

(۱) ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد —— جو عام طور پر تاریخ میں غدر کے نام سے مشہور ہے —— مسلمانوں پر تباہی و بربادی، قتل و غارت نکبت و فلاکت، اور مصیبت و آفت کا ایسا دور آیا کہ وہ بجا طور پر کہہ سکتے تھے،

صبّت علیّ مصائب لو انہا
صبّت علی الایام صرن لیالیا!

یعنی:-
مجھ پر مصائب اس طرح ٹوٹے ہیں کہ:-
اگر یہ روزِ روشن پر ٹوٹتے تو وہ شبِ تار بن جاتا!

وہ کون سا ظلم تھا جو مسلمان پر اٹھ رہا تھا؟

زمین ان کی دشمن تھی، آسمان ان کا دشمن تھا، شجر و حجر ان کے دشمن تھے، حد یہ ہے کہ خود اپنے دست و بازو دشمن جان بن گئے تھے۔

یہ وہ دور تھا جب دھڑا دھڑ مسلمانوں کو پھانسیاں دی جا رہی تھیں، ان کی جائدادیں ضبط کی جا رہی تھیں، ان کے املاک و اسباب کو نیلام پر چڑھایا جا رہا تھا، ان کے کھیت چھینے جا رہے تھے، انہیں کالے پانی بھیجا جا رہا تھا، ان کے شاندار محلات و ایوانات ڈھائے جا رہے تھے، ان کے اشراف کو ذلیل اور رسوا کیا جا رہا تھا، ان کے مقابلے میں دوسری قوموں کے افراد کو آگے بڑھایا۔ اور سرافراز کیا جا رہا تھا۔

انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی۔ اس لیے وہ مسلمانوں سے بھڑکتے تھے، ہندوؤں کی پشت پناہی اور سرپرستی کرتے تھے۔

ہندوؤں نے آقاؤں کی تبدیلی بخوشی گوارا کر لی تھی، وہ اسی جوش و خروش اور سعادت و اطاعت کے ساتھ اب انگریزوں کی غلامی اور نیاز مندی پہ نازاں تھے جس طرح کبھی مسلمانوں کی غلامی پر فخر و ناز کیا کرتے تھے۔

......!

مسلمان انگریزوں سے متنفر تھے، اس لیے کہ وہ غاصب تھے!

——!

ہندوؤں سے بھی مسلمان بیزار تھے۔ اس لیے کہ وہ طوطا چشم ثابت ہوئے تھے۔!

اپنے آپ پر بھی مسلمانوں کو اعتماد نہیں رہ گیا تھا، اس لیے کہ اس جنگِ آزادی میں وہ اپنی ہر چیز ہار چکے تھے۔

نہ ان کے پاس دولت تھی کہ کاروبار میں منہمک ہو جاتے، نہ صنعت و حرفت کے مالک تھے کہ کامیابی کے ساتھ زندگی کے مراحل طے کرتے۔

زمینیں اور جاگیریں چھن چکی تھیں۔

باغات اور مکانات ہی نہیں اوقاف تک چھینے جا چکے تھے!

ہنٹر نے جو اپنے وقت میں I. C. S کے طبقۂ عالیہ کا ایک سربرآوردہ شخص تھا، اپنی کتاب

OUR INDIAN MUSALMANS

میں، مسلمانوں کو گالیاں دینے کے ساتھ ساتھ ان کے جگر فگار حالات سے متعلق، اپنے تاثرات و مشاہدات اور تجارب تفصیل سے پیش کیے ہیں،

اس وقت اچانک ایک شخص میدان میں آیا جس کے بارے میں ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ مسلمانوں کی خستہ حال، اور نڈھال قوم کا بے باک نقیب، پشتیبان اور ترجمان ثابت ہوگا،

——— میری مراد سر سید احمد خان سے ہے۔

غدر سے پہلے سر سید کی پوزیشن یہ تھی کہ قلعہ معلی سے ان کا آبائی رشتہ قائم تھا،

اور وہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے "جواد الدولہ" اور "عارف جنگ" کے خطابات سے سرفراز تھے، ساتھ ہی ساتھ انگریزی حکومت کے ملازم تھے، اور صدرِ امین کے ممتاز عہدے پر فائز تھے۔

غدر کے بعد سرسید نے محسوس کیا کہ اگر انگریز مستقل طور پر مسلمانوں کے دشمن رہے تو ہندوؤں کے تعاون سے وہ انہیں ختم کر دیں گے، اور اگر مسلمانوں نے جدید تعلیم نہ حاصل کی تو خود بخود ختم ہو جائیں گے، کیونکہ ہندو جدید تعلیم حاصل کر کے سرکاری دفاتر پر قابض ہوتے چلے جا رہے تھے۔

سرسید نے ایک طرف تو انگریزوں کی غلط فہمیاں رفع کیں، دوسری طرف جدید تعلیم سے مسلمانوں کو بہرہ ور کرنے کے لیے "مدرسۃ العلوم مسلمانان" ——— جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے ——— کی بنیاد ڈالی،

مسلمانوں کے لیے، ایک علیحدہ اور جداگانہ اقامتی درس گاہ کی ضرورت انہیں اس لیے محسوس ہوئی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے مذہب، روایات، اور شاندار ماضی سے ناواقف رہیں۔

سرسید کے زمانے میں تو ان پر کفر کے فتوے صادر کیے گئے لیکن اس حقیقت کا ہر شخص کو اعتراف ہے کہ اگر سرسید میدان میں نہ اترے ہوتے اور انہوں نے مسلمانوں کی پشتیبانی نہ کی ہوتی تو مسلمانوں کا آج کہیں وجود نہ ہوتا۔

---

(۲) زمانے کے ساتھ ساتھ احوال و ظروف بھی بدلتے رہتے ہیں۔

بے شک سرسید کے زمانے میں بہترین پالیسی یہی تھی کہ مسلمان سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور شورشوں سے الگ رہیں، اور اپنی تمام تر توجہ صرف تعمیری اور تعلیمی امور تک محدود رکھیں۔

لیکن چند نسلوں کے گزر جانے کے بعد یہ پالیسی فرسودہ ہو گئی۔

انگریز ایک جمہوری قوم ہے، اور اس کے نزدیک جمہوریت وہی ہے جو اس نے اپنے ملک میں رائج کر رکھی ہے؛

اس اصول کے ماتحت اس نے سیاسی اصلاحات POLITICAL REFORAMS کا سلسلہ شروع کیا، ان اصلاحات کے نفاذ نے مسلمانوں کی حیثیت ایک پسماندہ قوم کی کر دی ——— ایک پسماندہ اقلیت، ایک پسماندہ قوم!

محسن الملک اور آغا خاں وغیرہ نے صورت احوال کی نزاکت محسوس کر لی، وفد بنا کر شملہ پہنچے، اور جداگانہ انتخابات کا تحفہ لے کر واپس آئے ——— اس طرح یہ پسماندہ اقلیت کم از کم اپنے وکیلوں اور نمائندوں کے انتخاب کی حد تک آزاد ہو گئی۔

حالات تیزی سے پلٹا کھا رہے تھے۔

بلقان اور طرابلس میں جس طرح کے الم ٹوٹے انہوں نے مسلمانوں میں احساس پیدا کیا کہ برطانیہ کی بوس بحوع الارض صرف ہندوستان تک محدود نہیں، سارا عالم اسلام اس زد میں ہے،

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو لے شبلی کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیروان کب تک!

مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوئی اور اس بے چینی نے تحریک خدام کعبہ، کامریڈ، ہمدرد، الہلال، اور زمیندار کی صورت اختیار کر لی،

یہ دور ابھی جاری تھا کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور ۱۹۱۸ء میں اختتام وانجام پر پہونچی۔

اس جنگ کا سب سے زیادہ ہولناک اور تباہ کن اثر مسلمانوں پر اور ان کے مقامات مقدسہ، عتبات، عالیات اور مرکز خلافت پر پڑا۔

کئی اسلامی ممالک برطانیہ اور فرانس کے قبضہ میں آ گئے۔

خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کی حیثیت ایک قیدی کی ہو گئی ہے!

.....!

ترکوں سے من مانی کی شرائط صلح تسلیم کرانے کی تدبیریں دباؤ اور دہشت انگیزی کے ساتھ شروع ہو گئیں۔

اس نازک وقت نے تحریک خلافت کو جنم دیا۔

تحریک خلافت عبادت بھی علی برادران سے،

شوکت علی حکومت ہند کے محکمہ افیون کے افسر اعلیٰ تھے،

محمد علی ریاست رامپور کے ایک اعلیٰ عہدے دار تھے۔

کسے گمان ہو سکتا تھا یہ دونوں بھائی شعلۂ جوالہ بن کر نمودار ہوں گے اور سارے ہندوستان میں آگ لگا دیں گے؟

لیکن ایسا ہوا۔

ان رہنماؤں کے نعرۂ حق، جذبۂ جہاد اور شوق شہادت کا نتیجہ یہ نکلا کہ "تزلزل در ایوان کسریٰ" فتاد!

یہی تھے جنہوں نے ہندو مسلمان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا،

دونوں کو بھائی بھائی بنا دیا، جلال فرنگ کا طلسم توڑ دیا، فوج کی دہشت دور کر دی، پولیس کا خوف باطل کر دیا، جیل کو کشش انگیز چیز بنا دیا اور آج وہ ننگ جوانی

ہے جو زنداں میں نہیں'، "صرف جیل ہی نہیں، پھانسی کے تختے کو دل آویز بنا دیا، زندگی میں وہ کشش نہیں رہ گئی تھی جو حق کے لیے مرنے میں پیدا ہو گئی تھی، مسلمان اپنے تناسب آبادی کے لحاظ سے بہت زیادہ تعداد میں جیل گئے، پھانسی پر لٹکے، تباہ و برباد ہوئے لیکن ان کی عزیمت اور استقامت میں فرق نہیں آیا۔

لیکن ——!

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!

آسمان نے رنگ بدلا اور بساطِ اتحاد الٹ گئی،

گاندھی جی نے جواہر لال نہرو نے، موتی لال نے، پٹیل نے، پوری کانگریس نے دھوکا دیا!

ھندوستان میں بہت بڑے کانگریسی لیڈر سوامی شردھانند نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریک شروع کی، بہت سے مسلمانوں کو مرتد کر لیا، سنگھٹن کے زور پر ہندو مسلم فسادات کرائے، اور "ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو"!

کانگریس کے ایک سابق صدر، اور اکابر کانگریس کے مخدوم محترم پنڈت موہن مدن مالوی نے ہندو سبھا کو فروغ دیا، اور مسلمانوں کے خلاف مستقل مورچہ قائم کر لیا،

آزادی کی تحریک ختم ہو گئی!

ہندو مسلم اتحاد افسانۂ پارینہ بن گیا،

مسلمان لیڈر دہائی دیتے اور گاندھی سے فریاد کرتے رہے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے، ایک غیر جانبدار تماشائی کی طرح ان جگر خراش اور ہولناک مناظر کا مشاہدہ

کرتے رہے، اور علی برادران کا بھی حال یہ ہو گیا کہ :-

"آشیاں جل رہا، یہ ناتواں دیکھا کیے"!

یہ دوسرا دور جب ختم ہوا تو مسلمان قومی اعتبار سے ہیچ اور ناقابلِ التفات بن چکے تھے۔

کچھ مسلمانوں کو انگریزوں نے توڑ لیا تھا، اور خطابات و مناصب دام ہمرنگ زمین میں اسیر کر لیا تھا، کچھ مسلمانوں پر کانگریس کا جادو چل گیا تھا، اس نے اپنی آغوش شفق ان کے لیے کشادہ کر دی تھی :

کوئی جماعت یا قیادت ایسی نہیں تھی، جو مسلم قوم کی انفرادیت کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں سے جنگ آزما ہوتی، عالم مسلمین حیران، سرگشتہ اور پریشان تھے کہ کیا کریں؟ —— کدھر جائیں؟ —— کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

انگریزوں سے وہ متنفر تھے، لیکن ان کے مقابلے میں بے بس تھے، ہندوؤں سے بیزار تھے، لیکن ان سے جنگ کرنے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے،

اور جنگ کرتے بھی کس بل بوتے پر؟ کہیں بے سری فوج بھی کسی سے لڑ سکی ہے۔

---

(۲۰) اور عین اس وقت جب مایوسی کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی، جب احساس کمتری، بے حوصلگی، اور مایوسی نے مسلمانوں کو افسردہ اور مضمحل کر رکھا تھا، ایک آواز گونجی،

یہ آواز نہیں، بجلی کا کڑکا تھا!

بجلی کا کڑکا —— "زمین ہند کی جس نے ساری ہلا دی"!

یہ نعرہ، یہ کڑکا —— محمد علی جناح کا تھا!

رکھتا تھا دل میں تاب وتواں لو کروڑ کی
کہنے کو ناتواں تھا محمد علی جناح!

------!

اس نعرے سے سردار اور خاں بہادر چونکے، قوم پرور اور وطن پرست مسلمان بھڑکے،

یہ کڑکا ایسا تھا کہ ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ میں ہلچل مچ گئی، اور آنند بھون میں طوفان آگیا"!

لیکن عام مسلمانوں نے ایسا محسوس کیا، جیسے یہ ان کے دل کی آواز تھی، میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"!

یہ تھا اس لذت تقریر کا عالم"!

انگریزوں نے کہا،

"یہ مجذوب کی بڑ ہے بھلا کہیں کسی ملک کا جغرافیہ بھی بدلا جا سکتا ہے"؟

کانگریس نے،—— ہندو جماعتوں نے —— اور گاندھی جی نے کہا۔

"ہندوستان کی تقسیم" اک خواب ہے دیوانے کا"!

قوم پرور اور وطن پرست مسلمانوں نے یہ نعرہ سنا، اور کھکھلا کر ہنس پڑے،

"آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں"؟

مقدسین جمعیت علماء کی جبیں شکن آلود ہوگئیں، ایک جداگانہ مسلم مملکت کا تصور ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا،

اور، پٹھان کوٹ، یعنی جماعت اسلامی کے دارالامارت میں بھی خشم وعتاب کی بجلیاں چمکنے لگیں، "اسلامی مملکت کا نعرہ، ناآشنائے اسلام جناح کی زبان سے"؟ —— "اک فاسق وفاجر میں اور ایسی کراماتیں"؟

کانگریس کے ایوان میں، مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے صدر دفتر میں جمعیت علماء ہند کے دفتر میں، خاک ساروں کے کیمپ میں اور دوسری سیاسی جماعتوں کے مرکز میں، اس شخص کو زک دینے، اس کی سکیم کو ناکام بنانے اور اس کے نظریہ کو باطل قرار دینے کے منصوبے بن رہے تھے، لیکن جماعت اسلامی کے دارالامارۃ سے بے اماں اور بے پناہ حملوں کا تابڑ توڑ سلسلہ شروع ہو گیا۔

چنانچہ جب دیکھا کہ، عامۃ مسلمین، کانگریس سے کٹ کر، جمعیت علماء سے منہ موڑ کر، قوم پرور مسلمانوں سے قطع تعلق کر کے، اور جماعت اسلامی کی سنی کی ان سنی کر کے جوق در جوق قائد اعظم کے پرچم تلے جمع ہو رہے ہیں تو فرمایا گیا:-

"مسلمان انتہا درجے کے نادان ہوں گے، اگر وہ اب بھی حالات کی نزاکت کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھیں گے، وہ ابھی تک اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ ان کو یہ نمائشی جلسے اور جلوس اور کھوکھلے مظاہرے قومی ہلاکت سے بچا لیں گے۔ وہ ان لوگوں کی لیڈری پر اعتماد کر رہے ہیں، جن کے سامنے اپنی وزارت اور وجاہت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اپنی قوم کے لیے اپنا بال تک بیکا ہونا گوارا نہیں کر سکتے جو مسلمانوں کے مفاد کا نام صرف اس لیے بلند آہنگی سے لیتے ہیں کہ ایوان وزارت پر ان کا قبضہ رہے، جن کی بزدلی پر دشمنوں تک کو پورا پورا اعتماد ہے، جنہیں چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ جیل میں جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہو تو ہم تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہیں اور وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کے بجائے کنی کاٹ جاتے ہیں، جن کا یہ حال ہے کہ یورپ میں سرکار برطانیہ کو جنگ کا خطرہ پیش آتا ہے تو سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے

ہیں ——!

ایسے لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ یہ ان کی کشتی کو بھنور سے نکال لیں گے تو میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ان کی جو کشتی ہے وہ ڈوب کر رہے گی۔

یہ تقریروں کا نہیں جان جوکھوں کا کام ہے، اگر مسلمان جینا چاہتے ہیں تو ان کو اور خصوصاً ان کے نوجوانوں کو اپنا گرم خون زندگی کے لیے بھینٹ چڑھانے پر تیار ہو جانا چاہیے"! [1]

!.....

مولانا کی تحریر گرامی کا جو اقتباس اوپر پیش کیا گیا ہے اسے ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجیے، اس کا خلاصہ یہ ہے:-

۱ - پاکستان کی جدوجہد عبارت تھی —— نمائشی جلسوں —— جلوسوں اور کھوکھلے مظاہروں سے،

۲ - تحریک پاکستان کے مقتدا اور رہنما صرف وزارت اور وجاہت کے طالب تھے۔

۳ - یہ اپنی قوم کے لیے اپنا بال تک بیکا کرنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

۴ - ان کی بزدلی پر دشمنوں تک کو پورا پورا اعتماد تھا۔

۵ - ان کے سامنے جب یہ تجویز رکھی گئی کہ "جیل چلو" اور لاٹھیاں کھاؤ، اور آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں ہمارا ساتھ دو تو یہ کنی کاٹ گئے۔

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصۂ دوم، ص ۲۱۵

۶ ۔ جنگ کے موقع پر انہوں نے سب سے پہلے اپنے وفادارانہ خدمات سرکارِ برطانیہ کی خدمت میں پیش کیے ۔

۷ ۔ مولانا پیشین گوئی فرماتے ہیں کہ یہ کشتی (پاکستان کی کشتی) ڈوب کر رہے گی ۔

۸ ۔ مسلمان جینا چاہتے ہیں تو اپنا گرم خون زندگی کے لیے بھینٹ چڑھانے پر تیار ہو جائیں " !

اب ذرا ان ارشادات عالیہ کو واقعات وحقائق اور تنقید واحتساب کی کسوٹی پر کسیے ، اور دیکھیے اور غرق حیرت ہو جائیے کہ وہ لوگ جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے " سلون چشم بددور ہیں آپ دیں گے " ! " جب " سچ " بولنے پر آتے ہیں تو جھوٹ کو کتنا شرمندہ ہونا پڑتا ہے " ۔

ہم مولانا کے ارشادات پر نمبروار گفتگو کریں گے ۔

۱ ۔ اگر پاکستان کی جدوجہد عبارت تھی نمائشی جلسوں ، جلوسوں اور کھوکھلے نعروں سے ، تو دنیا کی ہر تحریک آزادی کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے :۔

مسلم لیگ کا نعرہ یہ تھا کہ :۔

" مسلمان انگریز کے غلام نہیں رہ سکتے ۔

ہندوؤں کی بالادستی اور غلامی بھی مسلمانوں کو منظور نہیں ہے ۔

مسلمانوں کو ایک آزاد اور خود مختار وطن چاہیے اور یہ وطن ہر قیمت پر وہ حاصل کر کے رہیں گے ۔

ان میں سے کون سی بات نمائشی اور کھوکھلی تھی ؟

اگر یہ نمائشی اور کھوکھلی بات ہوتی تو عروس کامیابی سے ہم کنار نہ ہوتی !

۲ ۔ یہ الزام کہ تحریکِ پاکستان کے مقتدا اور رہنما وزارت اور وجاہت کے

طالب تھے، اتنی بڑی غلط بیانی ہے جس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی،

آج ہم دیکھتے ہیں کہ وزارت اور وجاہت کے لیے بڑی آسانی سے لوگ اپنا مسلک بدل لیتے ہیں، پارٹی بدل لیتے ہیں، لیکن مسلم لیگ کے دور میں بھی کیا ایسا تھا۔ یوپی میں، سی پی میں، بمبئی میں، مدراس میں، ہر جگہ کانگریس وزارت کی سوغات لیے مسلم لیگی ممبران مجلس ساز کے پیچھے پیچھے گھومتی تھی، لیکن سارے ہندوستان میں اسے ایک مسلم لیگی بھی نہ ملا، جس نے مسلم لیگ سے ترک تعلق کر کے وزارت قبول کر لی ہو، صرف کانگریس ہی نہیں، انگریز وائسرائے اور گورنر بھی کسی مسلم لیگی کو توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بلکہ الٹا یہ ہوا کہ لوگ کانگریس، اور حکومت کو چھوڑ چھوڑ کر مسلم لیگ میں آ آ کر شریک ہونے لگے۔

دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں جب کانگریس نے وزارت چھوڑی، مسلم لیگ چاہتی تو "دوسری بڑی سیاسی پارٹی" کی حیثیت سے یہ ذمہ داری قبول کر سکتی تھی، لیکن ——— اصرار اور التجا کے باوجود اس نے ایسا نہیں کیا۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد جب پہلی مرتبہ صوبوں کو داخلی خود مختاری ملی، تو کانگریس نے اعلان کیا کہ وہ اس وقت تک وزارت قبول نہیں کرے گی جب تک گورنر یہ وعدہ نہ کریں کہ اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے، گورنروں نے یہ وعدہ نہیں کیا، کانگریس نے وزارت نہیں بنائی، ہر اسمبلی میں، کانگریس کے بعد دوسری بڑی پارٹی مسلم لیگ ہی کی تھی، ہر صوبے میں گورنر کی طرف سے تشکیل وزارت کی دعوت لیگ کو دی گئی، بمبئی کے سر علی محمد خاں کو گورنر کی طرف سے جب تشکیلِ وزارت کی دعوت دی گئی تو وہ خوش خوش قائداعظم کے پاس آئے، اور اجازت طلب کی، ان سطروں کا لکھنے والا اس وقت قائداعظم کی خدمت میں حاضر تھا، قائداعظم نے ان کی بے قراری سے ذرا بھی متاثر ہوئے

بغیر پوچھا،

"کیا تمہیں اسمبلی میں WORKING MAGORITY حاصل ہے؟

سر علی نے جواب دیا:

"نہیں تو ——

قائدِ اعظم نے فرمایا،

"پھر میں تمہیں وزارت بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا، کل جب کانگرس اور انگریز میں صلح ہو جائے گی، اور ضرور ہو گی تو تمہاری پوزیشن کیا ہو گی؟ کیا تم استعفا دینے پر مجبور نہیں ہو گے"؟

سر علی نے گردن جھکالی —— ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم"۔

اگر قائدِ اعظم اور ان کے رفقاء وزارت اور وجاہت کے بھوکے ہوتے تو کیا ان کا طرزِ عمل یہی ہوتا؟

قائدِ اعظم کو کب وزارت نہیں مل سکتی تھی؟ وزارت کیا گورنری تک مل سکتی تھی، یہی حال ان کے رفقاء کا تھا، ان پر اتنا بڑا اور سنگین الزام کم از کم ایک عالمِ دین کی طرف سے تو عائد نہیں ہونا چاہیے تھا، انّ بعض الظن اثم ایسے ہی مواقع کے لیے ارشاد ہوا ہے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے!

جو شخص اتنا با اصول ہو اس پر اتنی بڑی تہمت کوئی بہت بڑا آدمی ہی لگا سکتا ہے۔

(۳) وہ کون لوگ تھے جنہیں قائدِ اعظم اور ان کے رفقاء کی بزدلی پر اعتماد تھا؟

کس موقع پر قائداعظم اور ان کے ساتھیوں نے بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا؟
کب وہ اپنے اصول سے ہٹے۔ اور ڈر کر اور دب کر صلح کر لی؟
مولانا یا ان کے ہم خیال اصحاب ایک مثال بھی اس طرح کی پیش نہیں کر سکتے، البتہ الزام تراشی اور تہمت تراشی سے انہیں کوئی روک بھی نہیں سکتا۔ آپ جو چاہیں کریں، آپ کی بن آئی ہے!

۴:- اس کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ بہتان صریح ہے، جسے حقیقت اور واقعہ سے دور کا بھی تعلق نہیں،

گاندھی جی یا کانگرس کی طرف سے کبھی یہ پیش کش نہیں کی گئی کہ "اگر تم ہمارے ساتھ جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہو تو ہم ہر بات ماننے کو تیار ہیں"۔

——— !

البتہ قائداعظم نے یہ ضرور کہا تھا کہ اگر تم ہمارے مطالبات مان لو تو ہم جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہیں،

اس بیان کے جواب میں انتہائی ہوشیاری سے گاندھی جی نے ایک خط لکھ کر، کوئی ذمہ داری لیے اور کوئی وعدہ کیے بغیر قائداعظم سے ملاقات کی درخواست کی،

کانگرس اگر قائداعظم کے مطالبات غیر مشروط طور پر مان لیتی اور اس کے بعد قائداعظم اس کا ساتھ نہ دیتے تو یقیناً ان کی قیادت عظمیٰ ختم ہو جاتی،

قائداعظم کی بزدلی پر اگر واقعی کانگریس کو پورا پورا کیا ذرا بھی اعتماد ہوتا تو وہ بے چون و چرا مطالبات تسلیم کر لیتی اور اس طرح قائداعظم کو بے نقاب کر دیتی، اور اپنے مطالبات منظور ہوتے دیکھ کر مسلمانوں کا سواد اعظم خود بخود کانگریس کے ساتھ ہو جاتا، مسلمانوں کو ساتھ ملانے اور قائداعظم کو راستے سے ہٹانے کی اس سے

بہتر کوئی اور تدبیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

لیکن کانگریس نے ایسا نہیں کیا، وہ ایسا کر بھی نہیں سکتی تھی، جس جماعت کا اصول اور شعار یہ رہا ہو کہ اپنے فیصلوں سے روگرداں ہو جائے، وعدوں سے پھر جائے، تجویزوں کو پس پشت ڈال دے، کمیونل ایوارڈ باقاعدہ منظور کرلے اور باقاعدہ مکر جائے، اس سے یہ توقع کی بھی کس طرح کی جا سکتی تھی؟

اور اگر قائداعظم نے کنی کاٹ ہی لی تھی تو مولانا کو کیا ہوا تھا۔

——— گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا؟

مولانا جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے کا عہد کر کے مسلمانوں کے مطالبات منظور کرا لیتے۔ آخر انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

۵ اور اس سے بڑا اتہام تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا کہ "یورپ میں سرکارِ برطانیہ کو جب جنگ کا خطرہ پیش آتا ہے تو یہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کر دیتے ہیں"!

کیا واقعۃً کبھی ایسا ہوا تھا؟

جنگ کے زمانے میں قائداعظم اور ان کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے خدمات سرکار برطانیہ کو اس طرح پیش کیے تھے:۔

- لارڈ ویول نے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے جب ایک مجلس مشاورت میں قائداعظم کو شرکت کی دعوت دی تو انہوں نے ترک موالات کرتے ہوئے شرکت سے صاف انکار دیا،
- وائسرائے نے جب "وار کونسل" (مجلس جنگ) بنائی تو قائداعظم نے مسلم لیگی حضرات کو اس میں شرکت سے منع کر دیا۔

اور جب وائسرائے نے دھوکے سے چند مسلم لیگیوں ——— سر سکندر

حیات، فضل الحق، سر سعد اللہ، نواب چھتاری، سر سلطان احمد ——— کو ممبر بنالیا تو قائدِ اعظم نے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی، سر سعد اللہ اور سکندر حیات خاں نے فوراً مجلس جنگ سے استعفاد سے دیا۔ مگر مسٹر فضل الحق، سر سلطان احمد، اور نواب چھتاری وغیرہ اس جرم میں لیگ سے خارج کر دیے گئے، اور اس سلسلے میں جو کشمکش ہوئی، اس سے سیاسیات ہند کا ہر طالب علم اچھی طرح واقف ہے۔

اگر یہی وفادارانہ خدمات ہیں تو بے شک قائدِ اعظم نے دوسری جنگِ عظیم میں سرکارِ برطانیہ کے ناقابلِ فراموش وفادارانہ خدمات انجام دیے۔

مولانا نے یہ کہانی جو بالکل بے اصل تھی سنا دی، لیکن وہ واقعہ نہ سنایا جب گاندھی جی نے وائسرائے کے سامنے اس خیال سے کہ اگر ہٹلر کے بم پارلیمنٹ اور قصرِ شاہی پر گرے تو کیا ہوگا، گریۂ بے اختیار کا مظاہرہ شروع فرما دیا تھا!

عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے لیکن کیا اتنی بڑی افسانہ طرازی بھی؟ ——— یہ استفتا ہے، ایک عامی کی طرف سے، ایک عالم کی خدمت میں.....!

مولانا کے ترکش کا ایک تیر:۔

"اس نئی حرکت (تحریکِ پاکستان) کے دور میں عامۂ مسلمین کی قیادت و رہنمائی، ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی، جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبے کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔

دینی کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے، اور اس قدر قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے"۔ [۱]

........!

افسوس اس بات کا ہے کہ مولانا اپنے مزعومات کو امر واقعہ بنا کر پیش کرنے کے عادی ہو چکے ہیں،۔

اور ان مزعومات کی جب تحلیل و تجزی کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ـــ

"خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم!"

تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں پر مولانا نے جو فردِ جرم عائد کی ہے وہ یہ ہے:۔

۱ اس تحریک کے رہنما علم دین سے بے بہرہ ہیں؛

۲ یہ قوم پرست ہیں؛

۳ دینی علم رکھنے والے لوگ اس تحریک میں نہ ہونے کی برابر ہیں۔

"قلم در کف دشمن است"۔ مولانا کی روائی تحریر پر کون قدغن لگا سکتا ہے۔ ورنہ حقیقت کا جہاں تک تعلق ہے، ان تینوں باتوں میں سے ایک بھی درست نہیں ہے۔

(۱) مولانا کو معلوم ہونا چاہیے، کہ جذبۂ دین، علم دین سے کم اہم نہیں ہے"، علم ہے تخمین و ظن، عشق ہے ام الکتاب!"

---

[۱] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصۂ دوم، ص ۶، ۷ ـــــ مطبوعہ ماہ جون ۱۹۴۲ء۔

اس تحریک کے قائد اعظم کے بارے میں یہ دعویٰ بے شک نہیں کیا جاسکتا کہ وہ فن تفسیر میں زمخشری اور رازی، فن حدیث میں بخاری و مسلم اور فن فقہ میں ابو حنیفہ اور شافعی تھے، لیکن جہاں تک دینی حمیت، اور مذہبی غیرت کا تعلق ہے، وہ اپنے عہد کے کتابی علم رکھنے والوں سے زیادہ صاحب کردار تھے۔

مسلم تہذیب و ثقافت کا سب سے بڑا مرکز دہلی تھا، لیکن آصف علی نے ارونا سے سول میرج کرلی، اور کسی نے ان کو بے دین کا خطاب نہیں دیا، مسلم تہذیب و ثقافت کا ایک بہت بڑا مرکز بنگال تھا، لیکن ہمایوں کبیر نے سول میرج کرلی، اور کسی نے انہیں بے دینی کا طعنہ نہ دیا، مسلم تہذیب و ثقافت کا ایک بہت بڑا مرکز صوبہ سرحد تھا، لیکن ڈاکٹر خاں صاحب نے ایک انگریز عورت سے سول میرج کی، اور ان کی صاحبزادی نے ایک سکھ عیسائی سے سول میرج فرمائی، اور خان صاحب نے بیٹی اور داماد کی شادی میں نہ صرف شرکت کی بلکہ دعائے برکت بھی دی۔ مگر کسی نے دم نہیں مارا، اس کے برعکس قائد اعظم نے مس رتن پٹیٹ کو پہلے مسلمان کیا، پھر شادی کی، اور ان کی لڑکی نے جو ننھال میں ——— مال کی وفات کے باعث پلی تھی ——— جب اپنے ننھالی خاندان کے ایک غیر مسلم فرد سے شادی کی، تو اسے عاق کر دیا اور مرتے دم تک اپنی اکلوتی اور چہیتی لڑکی کا منہ نہ دیکھا۔

(۲) - قوم پرستی کا طعنہ مولانا اکثر دیتے رہتے ہیں، لیکن، اگر قوم پرستی دین کے تحفظ کے لیے ہو، دین کی سربلندی کے لیے، دین کی حکومت کے لیے ہو تو اسے معتوب و مہجور قرار دینا کس آیت اور حدیث کی رو سے جرم ہے؟ کسی اچھے بھلے اور بے ضرر سے لفظ کو پہلے بدنام کرنا اور پھر اس کے خلاف مورچہ قائم کر دینا نہ جانے کون سی دینی تکنیک ہے!

(۳) یہ دعوے اور الزام کہ دینی علم رکھنے والے قائدِ اعظم کے ساتھ بہ منزلۂ صفر کے تھے یک سر بے بنیاد اور سراسر باطل ہے۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے علی الاعلان، صاف، واضح، اور غیر مشتبہ الفاظ میں قائدِ اعظم کی قیادت پر اعتماد، اور مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد سے اتفاق اور تحریک پاکستان سے ہمدردی کا اظہار فرمایا۔

کیا مولانا اشرف علی کا یگانہ علم و فضل بحث و گفتگو کا موضوع بن سکتا ہے؟

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کا علمی اور دینی پایہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے ——— کیا انھوں نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے لیے اپنی عمرِ عزیز وقف نہیں کر دی تھی؟

مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے عالمِ اسلام کے مایۂ ناز فرزند ہیں، وہ ہمیشہ پاکستان کے کٹر حامی رہے، اور جب پاکستان بن گیا، تو ہجرت کر کے یہاں آگئے۔

مولانا ظفر احمد تھانوی نہ صرف مولانا اشرف علی کے عزیز قریب ہیں، بلکہ پاکستان کے قیام و بقا کے سلسلے میں انھوں نے گراں بہا خدمات انجام دی ہیں، مولانا ایک مفسر اور محدث اور فقیہ کی حیثیت سے جو پایہ رکھتے ہیں، اگر اس سے کوئی انکار کی جرأت کرتا ہے تو "چشمۂ آفتاب را چہ گناہ"؟

ان حقائق کے باوجود اگر مولانا اس پر بضد ہیں کہ تحریکِ پاکستان میں اہلِ دین کا کوئی حصہ نہیں تھا تو خاموشی کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے؟

قائداعظم پر، مولانا کے جو حملے ہوتے ہیں وہ کئی طرح کے ہوتے ہیں، کبھی استعارے کے رنگ میں، کبھی تمثیل کے طور پر، اور کبھی علی الاعلان۔

اس آخری قسم کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے

:- وہ قائداعظم کو ایک ایکٹر کے نام سے یاد کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"اس اداکار کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے زیادہ ناکام ہے"!

دس سال سے مسلمانوں کی قیادت عظمیٰ جس لائحۂ عمل پر چل رہی تھی وہ:۔

① سلطان عبدالحمید خان کی سیاست سے ملتا جلتا تھا۔

جس طرح وہ ۳۳ سال تک محض دول یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھاتا رہا خود ترکی کی کوئی طاقت نہ بنائی، اسی طرح:۔

② اس قیادت کا بھی سارا کھیل بس انگریز اور کانگریس کی کشمکش سے فائدہ اٹھانے تک محدود رہا۔

③ اب وہ مجبور ہو گئی کہ جو کچھ جن شرائط پر ملے، اسے غنیمت سمجھ کر قبول کرلے۔

④ بنگال و پنجاب کی تقسیم اسے بے چون وچرا ماننی پڑی۔

⑤ سرحدوں کے تعین جیسے نازک مسئلے کو اسے صرف ایک شخص کے فیصلے پر چھوڑ دینا پڑا۔

..........!

مذکورہ عبارت مولانا کی ہے، مباحث کی وضاحت کے لیے نمبر میں نے لگا دیے ہیں۔

① قائداعظم کی سیاست کو مولانا نے سلطان عبدالحمید خاں کی سیاست سے تشبیہ دے کر سلطان عبدالحمید خاں کی عزت افزائی کی ہو یا نہ کی ہو، لیکن قائداعظم کی توہین ضرور کی ہے۔

مولانا نے اس حقیقت کو نظر انداز فرما دیا کہ سلطان عبدالحمید خاں، دنیا کی ایک بہت بڑی مملکت کا فرماں روا تھا، جس کی حکومت ایشیا میں بھی تھی، اور یورپ میں بھی، بلقان کی ریاستیں جس کی باج گزار تھیں، مصر، شام، بلادِ عرب اور حجاز مقدس پر اس کا سکہ چلتا تھا، اس کے پاس بہت بڑی فوج تھی۔ آلاتِ جنگ تھے، خزانۂ عامرہ تھا، غیر ممالک سے براہِ راست اس کے دوستانہ یا مخالفانہ تعلقات تھے، اس نے اگر، دول یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھایا، تو وہ ایسا کر سکتا تھا، اور اگر اس ۳۳ سال کی طویل مدت میں اپنے ملک کو اتنے عظیم وسائل و ذرائع کے باوجود مضبوط نہ کر سکا تو برا کیا؟

لیاقت قائداعظم، ایک غلام ملک کے باشندے تھے۔

قائداعظم کے پاس فوج نہیں تھی، خزانۂ عامرہ نہیں تھا، آلاتِ جنگ نہیں تھے، ممالک غیر سے ان کے براہِ راست تعلقات نہیں تھے، حد یہ ہے کہ مسلم اور عرب ممالک تک نہ صرف یہ کہ ان کی اسکیم، ان کی تحریک اور ان کے مطالبے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے، بلکہ بعض مزاحم تھے۔

انگریز اور ہندو کی آویزش گھریلو جھگڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

ہندو اپنی جگہ مطمئن تھے کہ اس برعظیم کی مملکت کے مالک وہی بنیں گے، کیونکہ وہ غالب ترین اکثریت کے حامل ہیں، اور جمہوریت کے اس دور میں اکثریت کو حکومت کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

انگریز بھی اپنی جگہ یہ طے کیے ہوئے تھے کہ آخر کار عنانِ حکومت ہندوؤں کے

حوالے کرنی پڑے گی، کیونکہ ان کے دیس میں جو جمہوریت رائج تھی اس کی روح یہی تھی کہ حکومت کی باگ اکثریت کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔

قائداعظم کا مطالبہ ہندوؤں کے لیے یوں ناقابلِ قبول تھا کہ وہ "اپنے" ملک کے حصے بخرے کرنے پر رضامند ہو جاتے تو اپنے ملک سے اور آنے والی نسلوں سے غداری کرتے، اور انگریزوں کے لیے اس لیے ناقابلِ اعتنا تھا کہ وہ ایک اقلیت کو خوش کرنے کے لیے ایک عظیم اکثریت کو کیوں خفا کر لیتے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ متحدہ ہندوستان خود ان کے سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے بھی مفید تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ ہندوستان کو تقسیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم گاؤ ماتا کے ٹکڑے اپنے ہاتھ سے کر دیں، اور ہندوستان کے فوجی وائسرائے لارڈ ویول نے بڑے دن کے موقعہ پر کلکتہ میں سالانہ تقریر کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ کسی ملک کا جغرافیہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔!

.....!

ان حالات میں قائداعظم مطالبۂ پاکستان پر اڑ گئے، انہوں نے اپنی قوم کو اس درجہ منظم، طاقت ور اور متحد صرف دس سال کی مدت میں بنا لیا کہ گاندھی جی اپنے ہاتھ سے گئو ماتا کے ٹکڑے کرنے اور ماؤنٹ بیٹن اس عظیم ملک کا جغرافیہ بدلنے پر تیار ہو گئے۔

ان برسہا اور واشگاف حقائق سے آنکھیں موند کر مولانا ایک ایسی بات فرماتے ہیں جو تاریخ کا معمولی طالب علم بھی نہیں کہہ سکتا، ہندوؤں سے پاکستان کا چھین لینا، اور انگریزوں سے مطالبۂ پاکستان کو منوا لینا، سب سے بڑا سیاسی معجزہ تھا، جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔ مولانا تاریخ کو اگر جھٹلاتے ہیں تو یہ ان کی بہت بڑی جسارت ہے ——— لیکن، افسوس ناک!

(۲) اس سے قیادت کا سارا کھیل یہ نہ تھا کہ انگریز اور کانگریس کی کشمکش سے فائدہ اٹھائے، اس لیے کہ دراصل ان دونوں میں کشمکش تھی ہی نہیں سمجھوتا تھا، ہماری قیادت کا اصل کھیل یہ تھا کہ اس نے اس خفیہ سمجھوتے کے پرخچے اڑا دیے، اور بالآخر اپنا مطالبہ منوا کر دم لیا۔

(۳) دس سے سال کی مدت میں ہماری قیادت نے قوم کی اخلاقی، مادی، اور تنظیمی طاقت اس درجہ مستحکم اور استوار کر دی کہ اسلامی ممالک میں سب سے بڑا ملک عالم وجود میں آگیا، ورنہ آج یہ ملک ہندوستان کا ایک حصہ ہوتا، ہندو اس پر حکومت کر رہے ہوتے۔

(۴) کانگریس اور انگریز کی "کشمکش" ختم ہونے کے بعد ہماری قیادت کے پاؤں تلے سے زمین نہیں کھسکی، امر واقعہ یہ تھا کہ، ہماری قیادت نے اپنا مطالبہ منوا کر، ہندوستان تقسیم کرا کے، اور پاکستان کو عالم وجود میں لا کر، انگریز اور ہندو کے پاؤں تلے سے زمین کھسکا دی۔

انگریزوں کے وہ توقعات ناکام ہو گئے جو فوجی، اقتصادی، اور سیاسی اعتبار سے وہ متحدہ ہندوستان سے وابستہ کیے ہوئے تھے، اور ہندوستان کا وہ خواب شیریں، خواب بے تعبیر بن گیا، جس کی رو سے متحدہ ہندوستان کی صورت میں وہ ایشیا کا قائد اعظم بننے والا تھا اور افغانستان و ایران تک کو اپنے دائرہ اثر اور دائرۂ اقتدار میں شامل کر لینے کی اسکیم تیار کر چکا تھا۔

(۵) جو کچھ جن شرائط پر ملا، وہ صرف پاکستان ہی کو نہیں ہندوستان ہی کو بھی ملا۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم اگر پاکستان کے لیے تکلیف دہ تھی تو اس سے کہیں زیادہ ہندوستان کے لیے تھی، مشرقی بنگال کو کھو دینے کے بعد وہ برما سے دور ہو گیا، جسے وہ اپنی نوآبادی بنانے کی فکر میں تھا اور مغربی پنجاب سے محروم ہو

جانے کے بعد وہ افغانستان اور ایران سے لاتعلق ہو گیا، حالانکہ اس کی دلی اور دیرینہ آرزو یہ تھی کہ وہ ان دونوں ممالک کو سرحد کی قربت کے باعث اپنے سیاسی اثر میں رکھے۔

(۹) سرحدوں کی تعین کا مسئلہ، ماننے پر پاکستان اور ہندوستان کی قیادت مجبور تھی،

انگریزوں نے اٹل فیصلہ یہ کر لیا تھا کہ وہ دونوں ملکوں کو آزاد کرتے ہی رخصت ہو جائیں گے۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ سرحدوں کا تعین تفصیلی جائزے کے بعد عمل میں آتا، لہٰذا دونوں نے متفقہ طور پر ایک شخص کو ثالث بنا لیا۔ اگر نہ بناتے اور انگریز چلے جاتے تو یہ مسئلہ خون کے سمندر بہ جانے کے باوجود آج تک حل نہ ہوتا۔

مولانا سے فکر و نظر کی بہت سی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، غلطی آدمی ہی سے ہوتی ہے۔ لیکن بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں، جو حد درجہ تباہ کن ہوتی ہیں، مولانا سے اس قسم کی غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے قائد اعظم کو پہچانا نہیں، یا پہچانا، مگر ان کے "انا" نے انہیں اعتراف نہیں کرنے دیا۔ انھوں نے اپنا حریف اس شخص کو بنایا جس کی اصول پروری، دیانت، امانت، خلوص کی دشمن بھی قسم کھاتے ہیں۔

قائد اعظم اپنی ذات اپنی شخصیت، اور اپنے کردار کے اعتبار سے عجیب و غریب خصائص کے حامل تھے۔ وہ جس طرح دینی حمیت سے بہرہ ور تھے اسی طرح غیرت ملی بھی ان کی خصوصیت تھی، وہ بہت بڑے نیشنلسٹ تھے، فرقہ پرستی کے بدترین مخالف، لیکن ۱۹۱۶ء کا "لکھنؤ پیکٹ" جو ہندو مسلم مساوات اور مسلمانوں

کی انفرادیت کا آئینہ دار تھا، تمام تر قائدِ اعظم ہی کی جدوجہد اور قیادت کا ثمرہ تھا۔ زندگی کے کسی دور میں بھی انہیں یہ بات گوارا نہ تھی کہ مسلمان کانگریس کے، یا ہندوؤں کے "کیمپ فالوور" بن کر رہیں، قائدِ اعظم کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان جدوجہد آزادی میں حصہ لیں، ہندوؤں سے تعاون کریں، لیکن تابع کی حیثیت سے نہیں رفیق اور ساتھی کی حیثیت سے۔

قائدِ اعظم برطانوی استعمار کے اتنے بڑے دشمن تھے کہ لارڈ ولنگڈن جیسے قہرمان شخص سے جو بمبئی کا گورنر تھا، لڑ پڑے، یہ معرکہ آرائی تاریخ آزادیٔ ہند کا روشن ترین باب ہے۔

جس ثبات و استقلال کے ساتھ قائدِ اعظم نے یہ جنگ لڑی، اس کا اعتراف کانگریس نے بمبئی کے سب سے گنجان اور خالص ہندو آبادی کے علاقے میں PEOPLE'S JINNAH HALL تعمیر کر کے دیا، سنگِ مرمر کے کتبے پر شاندار الفاظ میں ان کے اس کارنامے کو سراہا، اس ہال کو دیکھ کر، اور اس کتبے کو پڑھ کر مسز سروجنی نائیڈو نے پیرس میں جہاں قائدِ اعظم دادِ وصلے سے مستغنی آرام کر رہے تھے، تار دیا تھا،

"قوم نے پیغمبر کی زندگی میں اس کی قدر و منزلت پہچان لی!"

مجھے اچھی طرح یاد ہے عین اس زمانے میں جب کانگریس اس کی بدترین دشمن تھی، اور یہ کانگریس کا سخت ترین مخالف تھا، تاج محل ہوٹل بمبئی میں مسز سروجنی نائیڈو اپنے سوٹ میں دربار جمائے بیٹھی تھیں، سیاسیات حاضرہ پر گفتگو ہو رہی تھی، دورانِ گفتگو میں ایک مسلمان نیشنلسٹ نے جو کانگرس کی مجلسِ عاملہ کے ممبر بھی کسی زمانے میں رہ چکے تھے فرمایا،

"مسٹر جناح تو انگریزوں کے زرخرید ہیں!"

یہ سن کر مسز نائیڈو کا رنگ رخ متغیر ہو گیا، انھوں نے کہنے والے کو گھور کر دیکھا اور برافروختہ لہجے میں فرمایا:۔

"کیا کہا؟ —— جناح انگریزوں کا زر خرید ہے؟ ——
جھوٹ، غلط، بالکل غلط، ہم سب بک سکتے ہیں، لیکن جناح انمول ہے اسے کوئی خرید نہیں سکتا"!

پھر ذرا نرم لہجے میں کہنے والے سے انھوں نے فرمایا:۔

"بے شک جناح کی روش ہمارے نقطۂ نظر سے غلط ہی نہیں مہلک بھی ہے، لیکن یہ کسی ذاتی منفعت یا حبِ جاہ پر مبنی نہیں ہے، ذاتی منفعت کا جہاں تک تعلق ہے وہ خود قریب قریب کروڑپتی ہے اور حبِ جاہ کا یہ عالم ہے کہ جن انگریزوں کا تم اسے زر خرید کہہ رہے ہو، ان کا کوئی عہدہ یا خطاب اس نے کبھی قبول نہیں کیا، سچ کہنا کیا وہ بڑی آسانی سے ہائی کورٹ کا جج، گورنر، یا وائسرائے کا ایگزیکیٹو کونسلر نہیں بن سکتا تھا؟ مگر بنا؟ نہیں میرے بھائی نہیں، جناح کو جتنی چاہو گالیاں دے لو، لیکن اسے بکاؤ مال نہ سمجھو، وہ انمول ہے، اسے کوئی نہیں خرید نہیں سکتا، نہ کانگریس، نہ برطانیہ"!

حاضرین پر سکتے کا عالم طاری تھا، کسی میں بھی سروجنی دیوی کی تردید کا یارا نہیں تھا!

الفاظ کا جادو

ایک دل چسپ تکنیک بمغالطہ

قومیّت، ملیّت اسلامیّت

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا

قومیت، ملیت، اسلامیت، یہ تین لفظ ہیں، ان تینوں کا مفہوم بھی جدا جدا ہے اور دائرہ بھی الگ الگ، اگر کوئی شخص ان تینوں میں تفریق نہیں کرتا اور انہیں ایک قرار دیتا ہے، تو وہ حقائق سے ناآشنا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے خاندان سے محبت کرتا ہے، تو کیا وہ اسلام کا مجرم ہے؟

اگر کوئی شخص اپنے محلے والوں سے الفت رکھتا ہے تو کیا اس نے اسلام کا کوئی جرم کیا ہے؟

اگر کوئی شخص اپنے اہلِ شہر کا ہمدرد، بہی خواہ، اور دوست ہے تو کیا اس نے کوئی ایسی خطا کی ہے جسے اسلام معاف نہیں کر سکتا؟

اگر کوئی شخص اپنے ملک سے محبت اور شیفتگی رکھتا ہے تو کیا اس نے اسلام کا کوئی اصول توڑ دیا ہے؟

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کرتے وقت یہ نہیں فرمایا تھا:

"اے مکہ تو مجھے بہت عزیز ہے، لیکن تیرے باشندے مجھے یہاں نہیں رہنے دیتے"

غور کیجیے تو اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے اہلِ خاندان سے حسنِ سلوک کرو، اپنے ہمسایوں سے محبت کا برتاؤ کرو، اپنے ملک اور قوم کی دوستی کا دم بھرو، لیکن اگر میرا بھائی قاتل ہے، تو مجھے اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، میرے محلے والے ظالم ہیں تو مجھے ان کے ساتھ ہرگز نہیں رہنا چاہیے۔ میرے اہلِ ملک جفا پیشہ ہیں تو ان کا حق اعانت میرے اوپر سے ساقط ہو گیا، میں حق اور سچائی کا ساتھ دوں گا، قاتل بھائی کا، ظالم اہلِ محلہ کا، جفا پیشہ باشندگانِ ملک کا ساتھ نہیں دوں گا، اور اگر میں نے ایسا کیا تو اسلام کے ایوانِ عدالت میں میری حیثیت ایک مجرم کی ہو گی۔

پس اگر اسلام کے حدود و حقوق سے متصادم ہوئے بغیر کوئی شخص قوم پرور اور ملت دوست ہے تو یہ بات اسلامیت کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ قومیت، اسلامیت اور ملیت میں کوئی تصادم نہیں ہے بلکہ اشتراک ہے، کیونکہ اسلام ہر چیز کو اپنے دائرے میں سمیٹے ہوئے ہے۔

یہ تو دوسرے مذاہب ہیں جو کہتے ہیں کہ دین کا تعلق انسان کی ذات سے ہے یا گھر سے، یا عبادت گاہ سے، ایوانِ حکومت یا بزمِ سیاست میں وہ بار نہیں پا سکتا۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حسبِ روایت انجیل فرمایا ہے:

"قیصر کا حق قیصر کو، اور کلیسا کا حق کلیسا کو دو"

یعنی ایوانِ حکومت کا حق کچھ اور ہے اور کلیسا یعنی عبادت گاہ کا حق کچھ اور!

لیکن اسلام کی مسجد حکومت کا ایوان بھی ہے، اور سجدہ گاہ خلائق بھی۔
ملتِ اسلامیہ کا امیر، سالار عسکر بھی ہے، اور نماز کا امام بھی، اسلام میں زندگی کا ہر گوشہ "دین" سے تعلق رکھتا ہے۔

یہی کیفیت قومیت اور ملیت کی ہے۔

دوسروں کے ہاں قومیت کی تخلیق جنم بھومی، زادبوم، اور وطن سے ہوتی ہے۔
ہمارے ہاں قومیت کی بنیاد اسلام اور صرف اسلام ہے۔

انگریز وہ ہے جو انگلستان کا باشندہ ہو، فرنچ وہ ہے جس نے سرزمینِ فرانس میں آنکھ کھولی ہو، جرمن وہ ہے جو جرمنی میں پیدا ہوا ہو۔ روسی وہ ہے جس کی ولادت باسعادت روس میں ہوئی ہو، اور امریکی وہ ہے جو کتم عدم سے عالم وجود میں سرزمین امریکہ پر آیا ہو۔

کیا اس "قومیت" میں خود انسان کے ارادے کا بھی کوئی دخل ہے؟ قدرت نے جسے جہاں چاہا پیدا کر دیا، اور وہ وہاں کا مادرزاد "نیشنل" بن گیا۔

لیکن اسلامی "قومیت" کا فرد وہ ہے، جو اللہ کی یکتائی، اور محمدؐ کے رسول آخرالزماں ہونے پر ایمان رکھتا ہو، خواہ وہ کوئی ہو، اور کہیں کا رہنے والا ہو۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ دوسروں کے ہاں قومیت اور ملیت اتفاقی ہے اور حادثاتی ہے، ہمارے ہاں اختیاری اور ارادی ہے۔

انگلستان، یا فرانس، یا روس، یا جرمنی، یا امریکہ میں پیدا ہونا انسان کے اپنے بس کی چیز نہیں، یہ کارِ خدائی ہے، جسے جہاں چاہے جنم دے دے لیکن مسلمان بن جانا ہر شخص کے بس میں ہے۔

ایک قلیل ترین جماعت کے سوا کسی نے بھی مسلمانوں میں قومیت اور ملیت کا وہ مفہوم نہیں لیا جو دوسری قومیں اور ملتیں لیتی ہیں اور مولانا اسی مفروضے کی اساس

پر اپنی تحریروں میں پوری مسلم قوم، اور اس کے قابلِ صد احترام رہنماؤں کے خلاف خفگی اور ناخوشی کا اظہار فرماتے رہتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

دوسری طرف جماعت (اسلامی) چونکہ خود مسلمانوں کی قومی تحریک سے بھی اسی طرح کنارہ کش تھی جس طرح کانگریسی وطن پرستی کی تحریک سے الگ رہی تھی۔ اس لیے قوم کے ایک بجز قلیل گروہ کے، جو اسلام کے اصولوں کو فی الواقع سمجھتا اور ان کا سچا قدر دان تھا، قوم کی قوم جماعت سے شاکی اور ناخوش تھی، اس لیے جماعت کے لیے یہ سخت مشکلات اور شدید آزمائش کا وقت تھا۔[1]

!.....

کانگریس کی وطنی تحریک سے مولانا اگر الگ رہے تو یہ عین اسلامی فعل تھا۔ لیکن مسلمانوں کی "قومی تحریک" سے الگ رہ کر مولانا نے یقیناً تدبر کا ثبوت نہیں دیا۔ کیونکہ مسلمانوں کی یہ قومی تحریک ——— پاکستان ——— اس معنی میں ہرگز نہیں تھی جو غیر مسلم قومیں مراد لیتی ہیں۔ یہ قومی تحریک درحقیقت خالص اسلامی تحریک تھی، اس کا مقصد صرف احیائے دین تھا، اس کے سوا ہرگز کچھ اور نہ تھا، جیسا کہ قائداعظم نے بارہا اس کی تصریح بھی فرمائی، چنانچہ پاکستان بننے سے بہت پہلے انہوں نے فرمایا تھا:۔

"پاکستان کے تصور کو جو اب مسلمانوں کے لیے عقیدے کی حیثیت

---

[1] ترجمان القرآن، اگست ۱۹۴۸ء ص ۲۶۱

رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے، ان کی حفاظت نجات اور تقدیر کا راز اس میں پوشیدہ ہے، اس سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو از سرِ نو زندہ کرے گی!"[1]

!.....

لیکن اس صاف، واضح، اور غیر مشتبہ اعلان سے بھی مولانا مطمئن نہیں ہوئے، ان کے دل میں جو بات بیٹھ گئی تھی اس کو بار بار وہ دہراتے رہے:۔

مولانا اسلامی ذہن رکھتے ہیں، اسلامی فکر کے حامل ہیں، اسلام کی عالمگیریت کے قائل ہیں۔ ان سے بڑھ کر اس سچی بات سے اور کون واقف ہو سکتا ہے کہ کسی تحریک کی کامیابی کی شرطِ اولین یہ ہے کہ اس کا مرکز ایسا ہو جہاں وہ بے غل و غش اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکے۔

اسلام کی "ہجرت" کیا تھی؟

کفارِ مکہ کے درمیان رہ کر اسلام پھل پھول نہیں سکتا تھا لہٰذا داعیِ اسلام کو اپنا ایک نیا وطن بنانا پڑا، یہی اسلام کا وطن بھی بن گیا۔

"پاکستان بھی "ہجرت" ہے، یہ آخری منزلِ مقصود نہیں" ——— یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!"

---

[1] قائدِ اعظم کی تقریر، مارچ ۱۹۴۴ء

اسلام کس کا ہے؟

صرف چند لوگوں کا یا سب مسلمانوں کا؟

اسلام کی اجارہ داری

مذاہب عالم میں اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے کوئی خاص طبقہ جو دینیات و شعائر اور مراسم مذہبی کا اجارہ دار ہو، نہیں پیدا کیا، ۔ دوسرے الفاظ میں اسلام دنیا کا وہ پہلا مذہب ہے جس میں PRIEST HOOD یعنی برہمنیت یا پاپائیت نہیں ہے۔ اسلام نے اپنے دعوے کے استدلال میں جو چیز اختیار کی ہے، وہ عقل عامہ ہے، وہ لوگوں کی فہم و فکر پر تالا نہیں لگاتا، انہیں دعوت دیتا ہے کہ سوچیں، غور کریں، تعقل اور تفکر سے کام لیں، اس کے بعد اسلام قبول کریں۔

لیکن کچھ لوگ ہمیشہ سے اس کے ساعی رہے ہیں کہ یہ حق انہی کے لیے مخصوص کر دیا جائے، بعض نے بہ الفاظ واضح ان خیالات کا اظہار کیا ہے، بعض نے دبے دبے الفاظ میں اور کچھ ایسے مروان صفا کیش بھی ہیں جنہوں نے بے جھجک دوسروں کو

اسلام سے ناواقف اور ظلوم و جہول قرار دے کر واقفیت کا عمامہ خود زیب سر کر لیا ہے۔

اس بات میں جماعتِ اسلامی اور مولانا کا طرزِ عمل کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے شروع سے اس بات کے شاکی ہیں کہ دستور سازی اور قانون سازی کی ذمہ داری ملک کے منتخب لوگوں کے بجائے، ان لوگوں کے سپرد کی جائے جو اسلام کے ماہرِ خصوصی ہیں، یہ کام اگر دوسروں نے کیا تو اسلام سے ناواقفیت اور اناڑی پن کے باعث نہ جانے کہاں خود ڈوبیں کہاں دوسروں کو غرقاب کریں گے؟!

ارشاد ہوتا ہے :-

"دستور سازی کا کام جس کے جلد انجام پانے کی امیدیں دلائی جا رہی ہیں وہ کن لوگوں کے سپرد کیا گیا ہے؟ آپ خوب جانتے ہیں —— ان میں وہ لوگ شامل ہیں جو اسلام کے متعلق اتنا نہیں جانتے کہ وہ ہے کس چیز کا نام؟ جو نہیں جانتے کہ اسلامی حکومت کیا ہوتی ہے؟ جنہیں نہ قرآن سے تعلق ہے نہ حدیث سے، جو یہ کہتے پھرتے ہیں کہ امریکہ کا نظام اسلام کے نظام سے ملتا جلتا ہے۔ [۱]

.........!

ان کے ارشادات کو سامنے رکھ کر ان کے مضمرات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا، دستور سازی کی ذمہ داری مولانا صرف عالمانِ دین پر رکھنا چاہتے ہیں، بالفاظ دیگر وہ ملک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کی فکر، اسلام کی طرح آخری اور قطعی سمجھی جانی چاہیئے۔

---

[۱] سنت و بدعت کی کشمکش

ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۵۰ء، ص ۲۱۴

حالانکہ یہ بات سراسر روحِ اسلام کے خلاف ہے اور منافی ہے۔

دستور سازی کے سلسلے میں یہ مطالبہ تو کیا جاسکتا ہے کہ دستور کی کوئی شق، اور کوئی دفعہ اسلامی احکام و ہدایات کے خلاف نہ ہو، اور اس بات کا فیصلہ کہ اسلام کے خلاف کون بات ہے اور کون بات نہیں، وہی لوگ کریں گے جن کی فہم و دانش پر عوام نے اعتماد کیا ہے، اور مجلس آئین ساز میں انہیں اپنا نمائندہ منتخب کر کے بھیجا ہے۔

مسلمان قوم کی اکثریت سے یا مسلمان قوم سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اسلام کو منظر انداز کردیں گے بدگمانی اور بدظنی کی انتہا ہے۔

اسلامی حکومت کے بنیادی اور اساسی اصول تین ہیں۔

۱ : ہر شخص کے ساتھ خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم "عدل و احسان" کا ایک جیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔

۲ : امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

۳ : کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں رہبری۔

اسلام کو نمودار ہوئے چودہ سو سال کی طویل مدت گزر چکی ہے۔ اس مدت میں خلفائے راشدین، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے خلفاء بھی گزرے ہیں، بڑے بڑے، ائمہ، مجتہد، مفسر اور فقیہہ بھی گزرے ہیں۔

"اسلام کیا ہے؟ یہ بات بار بار ان ائمہ اور مجتہدین نے ہمیں بتائی، سمجھائی اور سمجھائی ہے، اسلامی حکومت کیا ہوتی ہے؟ اس سوال کو بھی حل کیا ہے ان کے افکار و مجتہدات مدوّن ہو چکے ہیں، جن تک ہر شخص رسائی حاصل کر سکتا ہے۔

ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کی تجدد احیاء کا کام اتنا مشکل نہیں ہے جتنا مولانا نے فرض کر لیا ہے۔

۔: اگر کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اسلامی نظام حکومت اور امریکہ کا نظام حکومت باہم مماثلت رکھتے ہیں تو انہیں قائل کیجیے کہ غلط کہتے ہیں۔ ثبوت دیجیے، دلیل پیش کیجیے، واقعات و حقائق کو سامنے رکھ کر گفتگو کیجیے، اصول موضوعہ کی طرح یہ باور کر لینا کہ فلاں نظام اسلام کے نظام سے مماثلت رکھتا ہے، اور فلاں نہیں رکھتا اور اپنے خیال کو آخری اور قطعی سمجھ لینا خود بینی اور خود ستائی تو ہے، حق بینی اور معاملہ فہمی نہیں ہے'!

جو لوگ پارلیمانی نظام میں نظام اسلام کی مماثلت دیکھتے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں، جن کے نزدیک امریکہ کے نظام میں اور اسلام کے نظام میں مماثلت ہے وہ بھی مسلمان ہیں ۔۔۔۔۔۔

> بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جو لوگ آئینی بادشاہت یا اشتراکیت کے نظام کو اسلام سے قریب سمجھتے ہیں ان کے اسلام پر بھی شک نہیں کیا جا سکتا۔

اصل بات یہ ہے کہ جس پر جس فکر کا غلبہ ہوتا ہے وہ اسی کو اسلام سے قریب خیال کرتا ہے، جن لوگوں کے نزدیک "شوریٰ" نظام اسلام کی اصل ہے، وہ پارلیمانی نظام کو پسند کرتے ہیں۔ جن کے نزدیک امام وقت کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہوتے ہیں، انہیں امریکی نظام اسلام سے قریب نظر آتا ہے'، جو لوگ حضرت ابوذر غفاری کا انداز فکر رکھتے ہیں انہیں اشتراکیت میں اسلام سے مماثلت نظر آتی ہے جو یوسفؑ اور سلیمانؑ کے واقعات سے متاثر ہیں، وہ اسلام میں بادشاہت کی گنجائش بھی دیکھتے ہیں، جو آئین الہٰی کی تابع تھی۔

لیکن کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ پارلیمانی نظام عین اسلام ہے۔ امریکی نظام میں اسلام کی روح سموئی ہوئی ہے، اشتراکی نظام اگر نہیں تو اسلام بھی نہیں، مقصد ہر شخص کا صرف یہ ہوتا ہے کہ ان نظاموں کو بہ آسانی مشرف بہ اسلام کیا جاسکتا ہے، یعنی انہیں ضروری ترامیم کے بعد اسلام کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے، یہ مسئلہ جنگ و پیکار کے بجائے باہمی افہام و تفہیم سے طے کرنے کا ہے لیکن رائی کا پہاڑ بناتے وقت اسے کفر و اسلام کا سوال بنا دینا زیادتی ہے۔

اور یہ اندازِ فکر کچھ نیا نہیں ہے۔

مسلمانوں کے اسلام کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا ان کے جذبۂ اسلامی کی تحقیر کرنا، انہیں اسلام سے دور کرنے کی کوشش کرنا، مولانا کا بہت پرانا شعار ہے ——— قیامِ پاکستان سے بھی کافی پہلے کا:۔

"اگر یہ آپ کی قومیت اور یہ آپ کا کلچر ہے۔ اور یہ آپ کے مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں، اسلام کا نام لینے کا آپ کو حق نہیں ہے"[1]

.....!

اور میں نہیں سمجھتا، اسلام ہی کا نام لینے پر آپ کو اصرار کیوں ہو۔

.....!

کتنی عجیب اور دل چسپ تلبیس ہے!

بجائے اس کے کہ اسلام کے پرچم تلے، عجز و انکسار، تواضع و فروتنی کے ساتھ

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۳۷

——— جو اہل اللہ کا خاصہ رہا ہے ——— لوگوں کو جمع کرنے کی سعی کی جائے۔ ان سے کہا جا رہا ہے تم اپنا نام اسلامی کے بجائے غیر اسلامی رکھ لو یعنی محمد حسین کے بجائے کانتا پرشاد بن جاؤ، اپنے آپ کو مسلمان نہ کہو، یہودی، عیسائی، ہندو، پارسی، جو چاہو کہو، مسلمان کہلائے جانے کا تم حق نہیں رکھتے، ہم نے یہ حق تم سے چھین لیا ہے ——— "ہم" نے! چاہے خدا نے نہ چھینا ہو۔

ایک اور ارشاد عالی :-

حال میں ایک نرالا اندازِ فکر پیدا ہوا ہے، کہ اسلام میں پرلیسٹ ہڈ نہیں ہے، قرآن اور سنت پر ملّا کا اجارہ نہیں ہے کہ بس وہی ان کی تعبیر کرنے کا مجاز ہو ——— یہ باتیں وہ لوگ کہتے ہیں جو نہ قرآن و سنت کی زبان سے واقف ہیں نہ اسلامی روایات پر جن کی نگاہ ہے، نہ اپنی زندگی کے چند روز بھی، جنہوں نے اسلام کے تحقیقی مطالعے میں صرف کیے ہیں ——— [1]

!.........

ممکن ہے یہ باتیں وہی لوگ کہتے ہوں، جو نہ قرآن و سنت کی زبان سے واقف ہیں، نہ اسلامی روایات پر جن کی نگاہ ہے، نہ اپنی زندگی کے چند روز بھی جنہوں نے اسلام کے تحقیقی مطالعے میں صرف کیے ہیں۔

لیکن بصد ادب سوال یہ ہے کہ جو لوگ قرآن اور سنت کی زبان سے بخوبی واقف ہیں، اسلامی روایات پر جن کی گہری اور وسیع نظر ہے، جنہوں نے اپنی

---

[1] اسلامی دستور کی تدوین، ص ۱۱

زندگی کے شب و روز صرف اسلام کے تحقیقی مطالعے میں صرف کیے ہیں، کیا وہ اسلام میں "پریسٹ ہڈ" کے قائل ہیں؟

صحیح بات اگر کوئی جاہل کہتا ہے تو بھی مان لینی چاہیے، غلط بات اگر کوئی عالم کہتا ہے تو بھی نہ ماننی چاہیے۔

سوال صرف اتنا ہے کہ آیا اسلام کے اندر "پریسٹ ہڈ" ہے؟

اس سوال کا دو ٹوک جواب ملنا چاہیے،

اور ہمیں یقین ہے کہ مولانا کا جواب بھی یہی ہوگا کہ اسلام میں "پریسٹ ہڈ" نہیں ہے۔

اور یہ جواب اس لیے ہوگا کہ واقعی اسلام میں پریسٹ ہڈ کا وجود نہیں ہے۔

اسلام کی اس سے بڑی کوئی توہین نہیں ہو سکتی کہ اس میں پریسٹ ہڈ ثابت کرنے کی سعی نافرجام کی جائے۔!

اسلام کی ۱۴ سو سال کی مکمل اور مستند تاریخ ہمارے سامنے ہے،

قرآن کریم ہمارے درمیان موجود ہے۔

احادیث نبوی، اور سنت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے۔

خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حیات گرامی کا ایک ایک گوشہ ہماری نظر کے سامنے ہے،

کیا مولانا یا ان کے ہم نوا کوئی ایک واقعہ بھی پریسٹ ہڈ کی تائید میں پیش فرما سکتے ہیں؟

خلفائے راشدین میں حضرت عمرؓ کے جلال و جبروت، اور رعب کا جو عالم تھا، وہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے۔

کیا انہی حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جب انہوں نے دیکھا لوگ مہر زیادہ رقم کا باندھنے لگے ہیں، تو انہوں نے کوشش کی کہ یہ رسم ختم ہو جائے، چنانچہ زیادہ رقم کے مہر پر پابندی عائد کرنی چاہی۔

لیکن ایک بڑھیا کو جب معلوم ہوا تو اس نے ان سے کہا:

"قرآن میں تو" قنطار[1]" کی کھلی اجازت دی گئی ہے۔ تم پابندی لگانے والے کون —؟

یہ سن کر حضرت عمرؓ کانپنے لگے، اور خاموش ہو گئے، انہوں نے یہ نہیں فرمایا اور پیر زال خاموش تو اسلام کو کیا جانے؟ ہم جانتے ہیں، اور جو کچھ ہم جانتے ہیں صرف وہی صحیح ہے!

صرف یہی ایک واقعہ پرلیسٹ ہڈ کے تصور کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے! ورنہ مثالیں بہت مل سکتی ہیں

---

[1] بے اندازہ رقم

صدر ایوب

اور

مولانا مودودی

آزردگی غیر سبب

۱۹۵۸ء میں مارشل لا نافذ ہوا،

مولانا مودودی اس فوجی انقلاب سے سخت برہم ہوئے لیکن فوجی انقلاب سے پہلے جو سول حکومت تھی کیا مولانا اس سے خوش تھے؟

اسکندر مرزا اور غلام محمد کو چھوڑیے کیا مولانا خواجہ ناظم الدین اور ان کی حکومت سے خوش تھے؟

ناظم الدین کو بھی نظر انداز کیجیے، کیا مولانا لیاقت علی خاں، اور ان کی حکومت سے خوش تھے۔

قائدِ اعظم کو بھی ذرا دیر کے لیے بھول جائیے کیا مولانا تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان سے خوش تھے؟

مولانا کسی سے بھی خوش نہیں تھے، پھر اگر وہ مارشل لاء سے ناخوش، اور

صدر ایوب سے بیزار ہیں تو اس پر حیرت کیوں کیجیے؟ درحقیقت وہ اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے، جب تک اقتدارِ حکومت ان کے ہاتھ میں نہ آجائے ــــ اس پر اڑے ہوئے ہیں، گو لر کا پھول لیں گے۔"

مارشل لاء پر، اس کے مالہ وما علیہ پر، صدر ایوب پر، ان کے آئین پر، ان کی حکومت پر، ان کے نظامِ حکومت پر مولانا کے جارحانہ حملے تاریخ محاربات سیاسی کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہیں۔

انھوں نے جس بے دردی، اور جس بے اصولی سے یہ جنگ لڑی ہے، وہ کسی درجہ میں بھی، اور کسی حیثیت سے بھی ان کے لیے قابلِ فخر نہیں ہے، اس جنگ میں انھوں نے ہر چیز داؤں پر لگادی، اخلاق، شائستگی، معقولیت ہر ایک سے ناطہ توڑ لیا، انھوں نے بے سوچے سمجھے جو چاہا کہا، اور کہتے چلے گئے، انھوں نے ایک جست میں، وہ تمام حدیں طے کرلیں جو تدبر اور معاملہ فہمی کی قائم کی ہوئی تھیں، انھوں نے بے اصولی کو اصول بنالیا، طنز و تعریض کو ادب عالیہ کا مقام عطا کردیا، اپنی کہی ہوئی باتوں کو جھٹلایا، اپنے دعووں کی تکذیب کی، اپنے دیے ہوئے فتووں کے خلاف نئے فتوے صادر کیے، جن باتوں کو عین شرع قرار دے چکے تھے، انھی کو خلافِ شرع متین قرار دینے لگے، جن اصولوں پر وہ کسی سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے، ان اصولوں کے انھوں نے خود پرخچے اڑادیے، جس "جمہوریت" کو وہ ملّا جیاں بناتے اور روحِ اسلام کے منافی سمجھتے تھے، وہی عین اسلام بن گئی۔ جو پارلیمانی نظام، معتوب، مردود اور مقہور رہا، وہی محبوب اور مرغوب بن گیا، جو اکثریت یعنی رائے عامہ یکسر ناقابلِ التفات تھی، اسی سے گوشۂ التفات کی دریوزہ گری کی جانے لگی، جو عورت مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) کی ممبری تک کی اہل نہ تھی اسی سے دامن پھیلا کر ووٹ طلب کیے جانے لگے جو دستور مجموعۂ نقائص

اور قطعاً ناقابلِ قبول تھا" ——— چودھری محمد علی کا دستور ——— وہی دستور دفعتاً بہترین دستور قرار پایا۔

یہ سب کیوں ہوا؟

جب قائداعظم کو زک دینا تھی، تو متحدہ ہندوستان بہتر تھا، جب لیاقت علی خاں کو راستے سے ہٹانا مقصود ہوا، تو عوام یاد آئے۔ جب ناظم الدین کے خلاف مورچہ بنایا گیا تو حکومتِ الہیہ کا ورد ہونے لگا۔ جب غلام محمد برسرِ اقتدار آئے تو ناظم الدین کی خوبیاں یاد آنے لگیں، جب اسکندر مرزا نے سازشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کیا تو "بیتے ہوئے دن عیش کے" تڑپانے لگے، جب مارشل لاء نافذ ہوا اور صدر ایوب برسرِ اقتدار آئے تو:۔

تو قائداعظم بھی اچھے ہو گئے، لیاقت علی کی خوبیوں کا برملا تذکرہ ہونے لگا چودھری محمد علی کا ذکرِ خیر مستقل موضوعِ گفتگو بن گیا، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ صدر ایوب کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی، پچھلے تمام معتوبین کی خطائیں بڑی فراخ دلی کے ساتھ معاف کر دی گئیں اور پیشِ نظر صرف ایوب خاں رہ گئے" زیادہ صاف الفاظ میں اگر کہا جائے تو کہا جا سکتا ہے، پچھلوں کی تمام جیتی سزائیں اور فروگزاشتیں صدر ایوب کے کھاتے میں ڈال دی گئیں ——— قصہ کوتہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود!

اس تلون کیشی اور سیماب وشی کا راز کیا ہے؟

یوں تو مولانا سب سے برہم تھے، لیکن سب سے زیادہ صدر ایوب سے برہم ہیں۔

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں!
لیکن اب کے سرگرانی اور ہے!

غور کیجیے اس غیر معمولی خفگی کا راز کیا ہے؟

قائدِ اعظم ایک سال سے زیادہ زندہ نہیں رہے، لیاقت علی خاں کو شرفِ شہادت حاصل کرنے کی جلدی تھی وہ بھی جلد رخصت ہو گئے۔ خواجہ ناظم الدین بھی شعلۂ مستعجل ثابت ہوئے، چودھری محمد علی، چندریگر، فیروز خاں نون، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، ان سب کے خلاف مولانا نے مورچہ قائم کیا، قوت اور شدت کے ساتھ جنگ کی، لیکن جنگ کا وقفہ طویل نہیں رہا، ایوب خاں کی صورت یہ ہے کہ انہیں برسرِ اقتدار آئے سات سال کے قریب ہو چکے ہیں اور بہ ظاہر اس مدت کے طویل تر ہونے کا امکان ہے، لہٰذا یہ آس بھی نہ رہی کہ جلد ایسے حالات رونما ہو سکتے ہیں کہ صالحین کی حکومت قائم کر دی جائے، اور حکومت کی سربراہی اپنے ہاتھ میں آجائے، ——— آس ایک چیز ہے دنیا میں اگر ٹوٹ نہ جائے! ——— صدر ایوب کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد یہ آس ٹوٹ گئی۔

جتنا جتنا صدر ایوب کا دورِ حکومت طویل ہوتا جا رہا ہے، مولانا کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی ہے!

مولانا کو یہ یاد ہے کہ صدر ایوب ایک فوجی آدمی ہیں، موجودہ دستور، مجلس دستور ساز کے بجائے خود انہی کا وضع کیا ہے، موجودہ نظامِ حکومت غیر جمہوری یعنی غیر پارلیمانی ہے۔ مولانا کے نزدیک جمہوریت صرف ایوانِ پارلیمنٹ ہی میں فروغ پا سکتی ہے، دوسرے نظام اگرچہ عوام کی آسودگی اور فلاح کے کتنے ہی ضامن کیوں نہ ہوں، ناقابلِ قبول، بلکہ ناقابلِ برداشت ہیں۔

لیکن ان باتوں کے ساتھ ساتھ مولانا کو جو چیز بالکل یاد نہیں رہتی وہ یہ ہے کہ صدر ایوب میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو ایک جمہوریت پسند اور عوامی لیڈر میں ہو سکتی ہیں، ان میں ہمت ہے، جرأت ہے عزیمت ہے، استقامت ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

اور یہ میرِ کارواں ان تینوں صفات سے متصف ہے۔

مولانا کو یہ بھی یاد ہے کہ موجودہ حکومت سے قبل انہیں وہ آزادیٔ تقریر و تحریر نہیں حاصل تھی جو آج حاصل ہے، اپنے رسالے "ترجمان القرآن" میں اپنے ملفوظات میں، بیانات میں، تقریروں میں، جلیبی درشت اور ناروا باتیں، تواتر، تسلسل، اور جوش و خروش کے ساتھ لکھیں اور کہیں، وہ دفترِ بے معنیٰ اپنے عجم اور ضخامت میں، گزشتہ سولہ سترہ سال کی تحریروں سے کہیں زیادہ ہے، پھر بھی وہ آزاد ہیں، جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں اور جو کچھ چاہتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

مولانا کو یہ بھی یاد ہے کہ پاکستان داخلی استحکام، اور خارجی وقار سے مدتیں گزریں کہ محروم چلا آرہا تھا، لیکن اب اسے یہ نعمت حاصل ہے، ایشیا کی قیادت ہندوستان کو حاصل تھی، لیکن اب وہ اس سے چھن چکی ہے اور پاکستان اس کا وارث بنتا جارہا ہے، کشمیر کا مسئلہ ایک قضیۂ پارینہ بن چکا تھا، لیکن اب اسے حیاتِ نو حاصل ہو چکی ہے، نخوتستان کا فتنہ اسکندر مرزا کے زمانے میں ایک طوفانِ بلاخیز بن گیا تھا۔ لیکن اب وہ کہاں ہے؟ امریکہ سے نیازمندی کا یہ عالم تھا کہ بوگرا مرحوم کے زمانے میں گیہوں سے لدے ہوئے جہاز جب کراچی کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے تو اونٹوں اور گدھوں پر جاسوس لشکر نکالا گیا، اور اس کے سیاسی استیلاء کی یہ کیفیت تھی کہ فرانسس پاور جب پشاور سے روس پر جاسوسی پرواز کرتا ہوا پہونچا اور گرا لیا گیا تو خروشیف نے دھمکی دی تھی کہ ہم پاکستان سے انتقام لے کر رہیں گے لیکن اب وہ روس دوستی کی دعوت دے رہا ہے۔ اپنے مکنیشین بھیج رہا ہے، تجارتی معاہدے کر رہا ہے، نہر سویز پر برطانوی

اور فرانسیسی حملے کے بعد پاکستان کی سکندری حکومت نے جو روش اختیار کی تھی اس نے عرب ممالک کو اس درجہ برافروختہ کر دیا تھا کہ وہ پاکستان کے قریب قریب مخالف ہو گئے تھے، لیکن موجودہ حکومت نے عراق، مصر، شام، سعودی عربیہ لیبیا، شرق اردن، تیونس اور الجزائر، وغیرہ سے اپنے تعلقات برادرانہ اور مخلصانہ طور پر کچھ اس طرح استوار کر لیے ہیں کہ پچھلی تلخیاں تقریباً فراموش ہو چکی ہیں،

مولانا کو یہ بھی یاد ہے کہ غلام محمد اور سکندر مرزا نے پاکستان کو اپنی جھولی میں ڈال لیا تھا، ری پبلکن پارٹی کا قیام راتوں رات عالم وجود میں آیا، اور وزارتوں کے ردوبدل کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بعض وزارتیں تو چند ماہ بھی قائم نہ رہ سکیں۔ مرکز کی یہی کیفیت تھی، اور صوبوں کا بھی یہی حال تھا۔ اس انتشار اور افراتفری نے کارکردگی پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا۔ اور ایک عجب طرح کی طوائف الملوکی پیدا ہو گئی تھی، نہ سرکاری ملازم یکسوئی سے اپنے فرائض انجام دے سکتے تھے، نہ وزراء ممبروں کے دباؤ سے آزاد ہو کر کام کر سکتے تھے، لیکن ایوب خاں کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد یہ صورتِ احوال بالکل ختم ہو گئی۔ اب نظم و نسق کی مشینری بغیر کسی رکاوٹ اور خلل کے چل رہی ہے، نہ وزراء ممبروں کے دبیل ہیں، نہ سرکاری حکام کسی خرخشے میں مبتلا ہیں۔ دونوں اپنی اپنی ذمے داریاں بے غل و غش انجام دے رہے ہیں۔

یہ ساری چیزیں مولانا کے لیے خلافِ توقع بھی ہیں، اور تکلیف دہ بھی۔ کیونکہ ان حالات میں انہیں اپنی کامیابی مشتبہ نظر آتی ہے، چنانچہ دیوانہ وار انہوں نے جارحانہ حملوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، کبھی مذہب کی دہائی دی، کبھی اسلام کو خطرے میں دکھایا، کبھی چند مختلف فیہ مسائل لے کر آگے بڑھے، اور دعوتِ مبارزت دینے لگے،

مولانا کو تو ایسے حالات درکار ہیں جو انتشار و خلفشار کے حامل ہوں، ان کی دعوت کے پنپنے کی اس کے سوا کوئی اور صورت ہی نہیں ہو سکتی۔

دانستہ یا نادانستہ بہر حال مولانا اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلام کا فروغ و بقا صرف انہی کی ذاتِ گرامی پر منحصر ہے، ایک عالمِ دین ہوتے ہوئے وہ اس قرآنی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اسلام کا انحصار تو داعیٔ اسلامؐ تک پر نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو آپؐ اس دنیا سے پردہ کیوں فرماتے؟ اور خدا آپؐ کی زبان سے بہ زبانِ وحی یہ اعلان کیوں کراتا کہ:۔

الیوم اکملت لکم دینکم، واتممت علیکم نعمتی،

تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ اسلام باقی رہے گا، اور مومن سربلند رہیں گے، اسلام مولانا کے اس دنیا میں آنے سے پہلے بھی موجود تھا، اب بھی موجود ہے اور جب خدانخواستہ وہ دن آئے گا کہ مولانا اس دنیا میں موجود نہ ہوں ـــــ اور خدا کرے وہ دن برسہا برس نہ آئے ـــــ تب بھی اسلام موجود رہے گا!

مولانا کے اس اضطراب، تشویش، اور سراسیمگی کا اصل راز کیا ہے؟

بات یہ ہے کہ مولانا کو آج تک کسی ایسے شخص سے پالا نہیں پڑا تھا جیسے صدر ایوب ہیں۔

اب تک انہیں دو طرح کے سربراہانِ مملکت سے سابقہ پڑتا رہا تھا، ایک وہ جنہوں نے مولانا کے افکار و مزعومات کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی، مولانا اپنی کہتے رہے، اور وہ سکوتِ سخن شناس سے کام لیتے رہے۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

یہ سرد مہری کا انداز گو تکلیف دہ تھا لیکن کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ بار بار جوبات دوہرائی جائے، اگرچہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو مگر بالآخر رنگ لاکر رہتی ہے چنانچہ مولانا محاذ پر ڈٹے رہے اور فضل گل کا انتظار کرنے لگے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ آئی نہیں۔

منتظر موسم گل کے ہیں تیرے دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

دوسری قسم کے سربراہانِ مملکت وہ تھے جو مقابلے میں آئے لیکن زیادہ دیر تک ٹھہرے نہیں، جماعتی خلفشار، داخلی آویزش، اور خارجی مسائل نے میدان سے ہٹنے پر انہیں مجبور کر دیا، اس طرح وسیع پیمانے پر مولانا کو پروپیگنڈا کرنے کا زریں موقعہ مل گیا اور اس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔

ایوب خاں ایک قائد کی حیثیت سے جب میدان میں آئے تو مولانا خوش تھے کہ مارشل لاء اٹھ جانے کے بعد وہ اس نئے قائد سے بہت اچھی طرح نمٹ لیں گے، اس لیے کہ یہ شخص نہ بلند آہنگ خطیب ہے، نہ شعلہ نوا واعظ، نہ سیاست کے داؤں پیچ جانتا ہے، نہ "مجلس آئین و دستور و اصلاح و حقوق" کے فلسفے کا رمز آشنا ہے۔ نہ اسے جماعتی سیاست کا تجربہ ہے، نہ یہ ایسے عظیم الشان اجتماعات میں جہاں السنالوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر منظر آتا ہے، زبان، گویا سے کام لے سکے گا۔ مارشل لاء کے بعد اس حریف نو آموز و تازہ وارد کو شکست فاش دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

لیکن کیا ایسا ہوا؟

واقعات و حقائق کا جواب نفی میں ہے،

اس حریف نو آموز و تازہ وارد نے اپنی خفتہ صلاحیتوں کا دشمنوں تک سے

لوہا منوالیا۔

اس نے ایک جہاں بلب، لیکن محبوب سیاسی جماعت کو "قم باذن اللہ" کہہ کر حیات نو بخش دی، ایسی حیات نو جو حیاتِ جاوداں کا پیش خیمہ ہے۔

اس نے عظیم الشان عوامی جلسوں کو خطاب کیا، اور اپنی خوش گفتاری، شیریں بیانی اور زورِ خطابت کی دھاک بٹھادی، اور دم کے دم میں عوامی لیڈر بن گیا۔

اس نے زرعی اصلاحات نافذ کر کے جہاں چند لوگوں کو اپنے سے خفا کیا وہاں لاکھوں آدمیوں کا دل جیت لیا۔

اس نے چور بازاری، رشوت، اور اسمگلنگ کے خلاف مورچہ قائم کیا اور اپنی تمام توانائیاں اس سماجی کوڑھ کے استیصال میں فتح کر دیں۔

اس فوجی آدمی نے نہایت خندہ جبینی، فراخ دلی اور کشادہ ظرفی سے اخبارات کی نکتہ چینی کا، مخالفوں کے جارحانہ حملوں کا، اور مخالفوں کے رد در رد طنز و تعریض شتم و عتاب اور اعتراض و ایراد کا پورے صبر و تحمل کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کیا۔

اس نے زبان پر اور قلم پر پہرے نہیں لگائے، جس نے جو کہا اسے گوش ہوش سے سنا، جو بات معقول نظر آئی، تسلیم کر لی، جو کم وزن معلوم ہوئی رد کر دی۔

اس نے اپنے بنائے ہوئے آئین میں، کئی ترمیمیں بہ رضا و رغبت کیں۔

اور اس احساس کو بالکل غالب نہیں آنے دیا کہ اس سے ساکھ میں فرق آئے گا، یا عوام میں ہیٹی ہوگی، یا مخالف اس کا غلط مفہوم لیں گے۔

لوگوں نے بنیادی حقوق مانگے، اس نے دے دیے۔

عدلیہ نے کئی مرتبہ ایسا کیا کہ اس کی قائم کی ہوئی حکومت کے خلاف فیصلے دیے اس نے تسلیم کر لیے۔

غیر ممالک کے اس نے دورے کیے اور وہاں اپنی آتش نوائی، تدبر بالمعاملہ فہمی اور اہلیت و صلاحیت کا سکہ بٹھا آیا۔

امریکہ اس کے مفاد سے ٹکرایا، یہ اس سے ٹکرا گیا؛

چین نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس نے بے تامل مصافحہ کر لیا۔

اس نے افغانستان کو اسلامی اخوت کے حصار میں کھینچا؛

اس نے عرب ممالک کی تلخیاں ختم کیں، اور ان سے گلے مل گیا؛

اس نے کشمیر کے مسئلے کو سرد خانے سے نکالا، اور دنیا کا اہم ترین مسئلہ بنا دیا۔

اس نے اپنے مختصر عہدِ صدارت میں وہ کچھ کر دکھایا جو برسہا برس میں نہ ہو سکا تھا!

مولانا نے چشمِ حیرت و حسرت یہ جگر فگار حقائق دیکھے اور شعلۂ جوالہ بن گئے ——!

شعلہ ہوں بھڑکا ہوں، غضب ہے مرا غصہ!

مولانا نے محسوس کر لیا کہ اس حریف سخت جان سے وہ کسی طرح بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، اور مایوسی کی انتہا آدمی کو مشتعل کر دیتی ہے، چنانچہ انہوں نے وفورِ غضب میں "جنگ تحت نشینی" شروع کر دی۔

انہی حالات میں مولانا سے ہمدردی کرنے کا جی چاہتا ہے، ویسی ہی ہمدردی جیسی موتی لال نے حسرت موہانی سے کی تھی، ایک اجتماع میں مولانا حسرت موہانی نے، پنڈت موتی لال کے خلاف تجویز ملامت پیش کی، لیکن مولانا اپنے

سوا کسی کا ووٹ نہ حاصل کر سکے، موتی لال اٹھے اور کہنے لگے :-

"مولانا میں آپ کی تائید کرتا ہوں، لیکن مجھے
آپ سے ہمدردی ہے، میں اور آپ مل کر
بھی ایک حقیر اقلیت ہیں"

قومی معاملات کو، ذاتی قسم کے جذبات سے الگ ہو کر دیکھنا چاہیے۔
مولانا صدر ایوب سے لاکھ خفا ہوں، لیکن وہ اس حقیقت سے انکار
نہیں کر سکتے کہ :-

:- صدر ایوب کے دور میں ملک کی خارجہ پالیسی جو تشکیل پذیر ہوئی
اس نے ہمارے ملک کو بہت زیادہ موقر بنا دیا ہے۔

●

:- صدر ایوب نے نظم و نسق کی جو اصلاح کی ہے، گذشتہ حکومتوں
کے کارناموں کو سامنے رکھ کر اگر اس کا تقابلی مطالعہ کیا جائے
تو یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ حالات خوش گوار طور پر پہلے سے
بہت زیادہ سدھر چکے ہیں۔
اور روز بروز سدھرتے چلے جا رہے ہیں۔

●

:- کشمیر کا مسئلہ اب اتنا تازہ اور جاندار بن گیا ہے کہ ہندوستان لاکھ من
مانی کارروائیاں کر گزرے مگر یہ ممکن نہیں کہ اب کشمیر کے بارے میں
وہ اپنی پالیسی بدلنے پر مجبور نہ ہو۔

●

:- مرکزی اسمبلی کے اختیارات میں رفتہ رفتہ توسیع ہو رہی ہے، اور حالات سازگار ہونے پر ان اختیارات میں یقیناً اور زیادہ اضافہ ہوگا۔

●

کیا یہ باتیں مولانا کیلئے خوش کن نہیں ہیں؟
اگر نہیں ہیں تو آخر مولانا کیا چاہتے ہیں۔ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ یہ ارشاد ہو!

منظرِ بازگشت!

چلے تم کہاں؟ میں نے تو دم لیا
فسانہ دلِ زار کہتے کہتے!

ایک بے انتہا اہم سوال!

میرے ان لوگوں میں نہیں ہوں جو ماضی کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ ماضی ہے۔ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے جب کبھی ماضی اور حال کا تقابلی مطالعہ کرتا ہوں، تو بعض عجیب چیزیں مجھ پر منکشف ہوتی ہیں۔ کل اور آج کا موازنہ کرتے ہوئے مواعظ و عبر کے بہت سے پہلو میرے سامنے آجاتے ہیں۔ ایسے جنہیں میں نظرانداز نہیں کر سکتا۔

سب سے عجیب انکشاف میرے لیے یہ ہے کہ کل "مذہبی سیاست" کارفرما تھی اور آج "سیاسی مذہب" کارفرما ہے۔ مذہبی سیاست اور سیاسی مذہب میں صرف لفظی ہیر پھیر نہیں، ایک گنجِ معانی پنہاں ہے۔

آج میں دیکھتا ہوں کہ دینیات اور اسلامیات کا موضوع زبان زد خاص و عام ہے۔ اسلامی معلومات کا حصول بہت زیادہ آسان ہے۔ اسلامی تاریخ، اسلامی تمدن، اسلامی معاشرت، اسلامی فلسفہ، اسلامی افکار سے متعلق آج بہترین قسم کا لٹریچر اردو

اور انگریزی میں موجود ہے۔ جس سے افادے اور استفادے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ گذشتہ ربع صدی میں جتنا گراں بہا مستند اور فکر آفریں مواد اسلام اور اسلامیات سے متعلق منظرِ عام پر آیا ہے، پہلے نہیں تھا۔ مدرسوں میں کالجوں میں، یونیورسٹیوں میں اسلامیات سے متعلق درس و تدریس کا سلسلہ قائم ہے، مقامی اور بیرونی اور بین الاقوامی شخصیتیں اس موضوع پر نئی نسل کے سامنے اپنے افکارِ عالیہ پیش کرتی رہتی ہیں۔

آج مذہبی جماعتیں، جس تنظیم جس پروگرام اور جس ہماہمی کے ساتھ سیاست کے میدان میں رونق افروز ہیں اور حکومت الٰہیہ کی دعوت اور حصولِ اقتدار کی جنگ میں مصروف ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم کا اوڑھنا، بچھونا مذہب اور صرف مذہب ہے لیکن قال کی دنیا سے نکل کر حال کی دنیا میں آیئے اور دیکھیے کیا واقعی ایسا ہے؟ کہیں یہ محض خوش فہمی تو نہیں؟ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ آج ہماری زندگی میں وہ مذہبیت، میرا مطلب ہے کہ مذہبیت کا وہ اخلاص کیوں نظر نہیں آتا۔ جو کل نظر آتا تھا، آپ شاید میری اس بات پر چونک پڑیں گے۔ یہ بات آپ کو کچھ عجیب سی نظر آئے گی۔ اور اگر آپ کا تعلق کسی ایسی جماعت سے ہے جو مذہب کو بر مقابلے میں آگے رکھتی ہے تو شاید خفا بھی ہو جائیں گے۔ لیکن سچ بہرحال سچ ہے خواہ آپ اسے چیں بہ جبیں ہو کر سنیں یا انشراحِ قلب کے ساتھ اس کی سماعت فرمائیں۔ اپنی تاریخ حال کا وہ باب جو حال سے متعلق ہے ذرا دیر کے لیے بند کر دیجیے اور وہ باب نکالیے جو کل سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کل جو گزر چکا ہے اب سے تقریباً ۵۰ سال پہلے کا ورق الٹیے۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک مذہبی تحریک۔ تحریک خلافت شروع کی، یہ تحریک سیاسی تھی لیکن اس کی بنیاد مذہب پر تھی! آج سے ۵۴ برس پہلے اقبال کی

شاعری بام عروج پر نہیں پہنچی تھی۔ اسلامیات سے متعلق وہ بیش بہا خزانہ جو آج عام ہے کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان مسلمان بنیں، ہندغلامی سے آزاد ہوں اور منہاج خلافت راشدہ پر اپنا نظام سیاسی استوار کریں۔ جو لوگ یہ مقصد لے کر اٹھے تھے۔ ان میں سے اکثر نہ عالم دین تھے۔ نہ مفتی شرع متین، کوئی علی گڑھ کا کھدڑا تھا، کوئی آکسفورڈ کا گریجوایٹ، کوئی کیمبرج کا پی۔ ایچ ڈی کوئی اڈنبرا کا الیف آر سی کوئی بیرسٹر، کوئی وکیل، کوئی آئی سی ایس، کوئی پی سی ایس لیکن ان کا دامن ہر طرح کے لوث اغراض سے پاک تھا۔ انہوں نے خدا کے لیے حب دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ پہلے یہ داڑھی منڈاتے تھے لیکن اب ان کی ریش دراز اعتماد صحیح کے لیے چیلنج بن گئی تھی، پہلے یہ نماز سے بے تعلق اور روزے سے بے پرواہ تھے لیکن اب ان کی راتیں مناجاتوں میں صرف ہوتیں۔ ان کے دن عبادت میں بسر ہوتے تھے۔ فرض روزوں کا کیا ذکر رمضان کے بغیر بھی یہ روزے رکھا کرتے تھے۔ یہ فیشن کی دنیا کے ہیرو تھے۔ ان کا سوٹ، ان کی ٹائی، ان کی ہیٹ، ان کا بوٹ، ان کی "صاحبیت" خود انگریزوں کے لیے باعث رشک تھی۔ لیکن اب یہ موٹے کھدر کے لباس میں شاد تھے۔ کوٹ اتار کر انہوں نے پھینک دیا عبا پہن لی، بوٹ چھوڑا، چپل پہن لی، لذیذ اور مرغن کھانے ترک کیے۔ فقر و فاقے کی زندگی اختیار کی، شاندار کوٹھیوں کا رہنا بھول گئے، جیل کے مستقل مکین بن گئے بقول جوہر ؎

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال،
ہم ہیں باشندے جیل خانے کے!

اور جیل خانہ آج کا جیل خانہ نہیں تھا، جہاں اسے کلاس اور بی کلاس کی آسائشیں اور آسانیاں حاصل ہیں۔ نصف صدی پہلے کا سیاسی قیدی خواہ علمی اور سماجی اعتبار سے کتنا ہی اونچا مقام کیوں نہ رکھتا ہو۔ جیل کے اندر اس میں اور اخلاقی قیدی میں کوئی

فرق و تفاوت نہیں تھا۔ چکی بھی پیسنا پڑتی تھی اور مونج بھی بٹنا پڑتا تھا، اور فرشِ زمین پر سونا بھی پڑتا تھا۔ رمضان کے مہینے میں روزہ رکھ کر یہ ساری مشقیں برداشت کرنا پڑتی تھیں۔

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضان بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا!

یہ سیاسی قیدی اپنی اہلیت اور قابلیت کے لحاظ سے گورنر اور جج، وزیر اور ایگزیکٹو کونسلر بننے کے مستحق تھے۔ اور بن بھی سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے عہدے اور منصب پر نگاہِ غلط انداز بھی نہیں ڈالی۔ اپنی وضع و طریق میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ بادشاہوں کے درباروں میں بھی پہنچے۔ شہریاروں کے آستانے پر بھی گئے لیکن کج کلاہ ہی نظر آئے۔ یہی وجہ تھی کہ عوام غیر مشروط طور پر ان کے ساتھ تھے!

انھوں نے اپنی قوم کو حکم دیا، سرکاری ایڈ پانے والی یونیورسٹیوں، کالجوں، اور مدرسوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اس حکم کے صادر ہوتے ہی دانش گاہوں میں خاک اڑنے لگی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ سرکاری ملازمتیں ترک کر دی جائیں، وکیل اور بیرسٹر پریکٹس چھوڑ دیں۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہائی کورٹ کے جج اور آئی سی ایس کے ممبر استعفے دینے لگے۔ وہ وکیل اور بیرسٹر، جن کی ماہوار آمدنی ہزار ہا روپے کی تھی درویش بن کر خانقاہ نشین ہو گئے، انھوں نے کہا غیر مسلم حکومت کے خلاف اگر تاب مقاومت نہ ہو تو ہجرت کرنی چاہیے۔ سننے والوں نے یہ سنا، گھر بار اونے پونے بیچا۔ اور ہجرت کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے فرمایا حکومت کے عطا کیے ہوئے خطابات واپس کر دو، فوراً ہی "خطاب تو بہ لقب تو" کا سلسلہ شروع ہو گیا اور خطاب یافتہ حضرات کی زندگی اجیرن ہو گئی۔

غرض انھوں نے درست یا نادرست اپنی قوم کو جو حکم دیا، ان کے اخلاص و للّٰہیت

دین داری کا عوام پر اتنا اثر تھا کہ فوراً اس کی تعمیل شروع ہو جاتی تھی اور رائے عامہ کے راستے میں مخلوط کو بگڑ دی سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا۔

یہ حال تھا کل کا! اب پھر ذرا دیر کے لیے اپنی تاریخ ملی کا وہ باب جو کل سے متعلق ہے بند کر دیجیے اور وہ باب نکالیے جس کا تعلق آج سے ہے۔ کچھ دیر کے لیے ماضی کو فراموش کر دیجیے۔ حال کو پیشِ منظر رکھیے۔ آج آپ کو اسلام کی دعوت قدم قدم پر ملے گی۔ تحریری طور پر بھی اور تقریری طور پر بھی، علمی طور پر بھی، اور فکری طور پر بھی اور ان دعوت دینے والوں میں عالمِ دین بھی ہیں اور مفتی شرع بھی، اور یہ دعوتِ تمام تر "عدم تشدد" پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شورش نہیں، بدامنی نہیں، ہنگامہ آرائی نہیں، سول نافرمانی کا پروگرام نہیں۔ دار و رسن کا اعلان نہیں بقول اقبال ؎

ترا بحر پرسکوں ہے یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں، نہ خرابیٔ کنارہ!

پھر بھی یہ دعوت قبولِ عام نہیں حاصل کرتی۔ اس کا کوئی سبب بھی تو ہوگا؟ وہ سبب کیا ہے؟ کہیں ایسی بات تو نہیں کہ ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے

اگرچہ ؎

وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی،

عوام کا جہاں تک تعلق ہے وہ اسلام کے لیے کیا نہیں کر سکتے؟ وہ اسلام کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں:۔

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے
تُو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

انھوں نے پاکستان جذبۂ اسلام سے مجبور ہو کر بنایا ہے۔ پھر قیامِ پاکستان کے

بعد کی ساری کٹھنائیاں اور تباہیاں اور بربادیاں اسلام کی محبت ہی میں جھیلی ہیں، بر خود غلط اور طالع آزما سیاست والوں کی لائی ہوئی مصیبتوں کو بھی اسلام ہی کے لیے انگیز کیا ہے۔

من و تو گرفتاشدیم چہ باک؟
غرض اندرمیاں سلامت اوست!

لہٰذا خامی عوام میں نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسلام کی دعوت دینے والے اسلام کی طرف بلانے والے، اور اسلام کی صدا بلند کرنے والے اخلاص اور بے لوثی کی اس منزل تک ابھی نہ پہنچ سکے ہوں۔ جہاں تک نصف صدی پہلے کے رہنما پہنچ گئے تھے۔ مقصد خدانخواستہ کسی کی تنقیص نہیں۔ روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ، لیکن، کل اور آج کا تقابلی مطالعہ کرتے وقت یہی بات میرے ذہن میں آتی ہے۔ گندم از گندم بروید جو ز جو، کہیں گندم کی جگہ جو اور جو کی جگہ گندم کی کاشت تو ہم نہیں کرتے رہے ہیں؟ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے ہم سب کے لیے۔

مقصد اسلام کی سربلندی ہے، مقصد پاکستان کی سرفرازی ہے، ہماری وہ زندگی لعنت ہے جو اسلام کے لیے نہ ہو، ہماری وہ زندگی موت سے بدتر ہے جو پاکستان کی فلاح کے لیے وقف نہ ہو۔ ہمیں اسلام عزیز ہے اور اسلام کی وجہ سے پاکستان عزیز ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم اپنا دل ٹٹولیں۔ کل اور آج کا بار بار موازنہ کریں ممکن ہے، وہ نکتہ ہاتھ آجائے جو ہمارے آج کو ہمارے کل سے یعنی ہمارے ماضی سے ہمارے حال کو ہم آہنگ کردے!

قائداعظم

اور

پاکستان

"قلندر جز دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا!"

قائد اعظم علوم اسلامیہ کے ماہر نہیں تھے۔

قلندر جز دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا!

فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا!

اقبال کی کائنات "حرف لاالہ" کے سوا کچھ نہ تھی، وہ لغت ہائے حجازی کے قارون نہیں تھے، لیکن ان کا دل حب اسلام سے معمور تھا، وہ داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے والہانہ شغف رکھتے تھے۔ انہیں اسلامی تہذیب پر ناز تھا، اسلامی تمدن پر فخر تھا، اسلامی ثقافت پر وہ جان دیتے تھے۔ اسلامی معاشرت کا اجلال و اکرام ان کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا۔ وہ سیاستدان بعد میں تھے اور مسلمان پہلے تھے، وہ سیاست کو اسلام پر قربان کر سکتے تھے، لیکن اسلام

کو سیاست پر قربان نہیں کر سکتے تھے، اسلام کے تحفظ اور دفاع کے لیے وہ سب سے لڑنے کو تیار رہتے تھے، ان کے یہ خصائص دشمنوں کے حلقے میں بھی، مابہ النزاع نہیں ہیں۔

لیکن مولانا مودودی نے اپنی تحریروں میں، قائداعظم کی جس چیز کو سب سے زیادہ شک وشبہ کی نظر سے دیکھا ہے، وہ ان کا اسلام ہے، ان کی جس چیز پر انتہائی بے دردی کے ساتھ حملہ کیا ہے، وہ ان کی "اسلامیت" ہے۔ ان کے جس اقدام وعمل کو سب سے زیادہ محل طنز وتعریض قرار دیا ہے۔ وہ ان کا جذبۂ دفاع اسلام ہے۔

ان مباحث پر گزشتہ صفحات میں کافی بحث ہو چکی ہے، اور میرے خیال میں وہ تشنہ نہیں ہے۔ پھر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے، اور پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے بعد قائداعظم نے جو تقریریں کی جو بیانات دیے، ان کے کچھ ایسے اقتباسات پیش کر دوں، جن سے مولانا کے مزعومات کی تردید اور زیادہ واضح انداز میں ہو سکے کہ ——— تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں"! قائداعظم کے خود اپنے ارشادات اسلام کے بارے میں جتنے مستند ہو سکتے ہیں اتنے ان کے کسی نقیب یا داعی کے نہیں ہو سکتے!

اسلام اور جمہوریت

اسلامی تعلیمات کی درخشندہ روایات و ادبیات کس امر پر شاھد ھیں، دنیا کی کوئی قوم جمہوریت میں مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی جو اپنے مذھب میں بھی جمہوری نکتہ نگاہ رکھتے ھیں۔

تقریر لکھنؤ

۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء

مسلمان اور ہندو کا فرق

وارد ھا کی تعلیمی اسکیم پر نظر ڈالیے۔ کیا اس کی ترکیب کے وقت مسلمانوں سے مشورہ کیا گیا۔ یہ تمام اسکیم مسلمانوں کی عدم موجودگی میں وضع اور مرتب کی گئی۔ اس کا بانی کون ہے؟ اس کے پیچھے کس کا دماغ کارفرما ہے؟ جناب گاندھی! مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ جس مقصد اور نصب العین کے پیش نظر کانگریس قائم کی گئی تھی۔ جناب گاندھی اس کو تباہ کر رہے ہیں۔ وہ کانگرس سے ہندوازم کی تجدید کا کام لینا چاہتے ہیں۔ مقصود ہندو مذہب کو تازہ اور ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا ہے اور جناب گاندھی کانگریس سے اس مقصد کا کام لے رہے ہیں۔

مسلمانوں میں وارد ھا اسکیم کا ردِ عمل یہی ہو سکتا تھا جو ہوا۔ آپ نے پیرپور رپورٹ پڑھی ہوگی۔ اس پر اضافہ کہنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ صورتِ حال کو ایک جملہ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہندو ذہنیت اور ہندو نظریہ کی ترویج کی جا رہی ہے اور مسلمانوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس کے قبول کرنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے، کیا مسلمانوں نے بھی کسی جگہ ایسی حرکت کی ہے۔ کیا انہوں نے ہندوؤں کو اسلامی ثقافت پڑھنے کی جدوجہد کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں نے جہاں خفیف سی آواز اٹھائی کہ ہندو ثقافت کیوں ہمارے سر مڑھی جا رہی ہے،

تو انہیں فرقہ پرست اور شورش انگیز ٹھہرایا گیا اور کانگریس کی جابرانہ قوت ان کے خلاف حرکت میں آگئی۔ بہار کے واقعات کو ہی دیکھ لیجیے۔ کانگریسی حکومت میں کس کی ثقافت کو دبایا گیا؟ مسلمانوں کی ثقافت کو! کس کے خلاف جابرانہ احکام جاری ہوئے کس کے خلاف امتناعی تدابیر اختیار کی گئیں۔ کن لوگوں کو گرفتار کیا گیا؟ مسلمانوں کو۔ مجھے ایک ایسا واقعہ بتایا جائے کہ گذشتہ ڈیڑھ سال میں مسلمانوں نے کسی جگہ ہندوؤں پر اپنی تہذیب عائد کرنے کی کوشش کی ہو (آوازیں کسی جگہ نہیں)..... !

تقریر پٹنہ

۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء

پیامِ عید

○

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے!

۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء

یوم عید کے موقع پر قائداعظم نے اپنی ملت کے نوجوانوں کو مخاطب کیا تھا، اور انہیں بتایا تھا کہ اسلام کی اصل روح کیا ہے؟ اور اس کو بروئے کار لا کر وہ کس طرح ملک و ملت اور انسانیت کی خدمت بجا لا سکتے ہیں۔

قائداعظم کا یہ پیام عید اتنا مؤثر تھا کہ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم تک اس سے بہت متاثر ہوئے۔ گاندھی جی نے اسے پڑھتے ہی مبارک باد کا خط بھیجا اور ان خیالات کی گیرائی اور گہرائی اور صداقت اور حقیقت کا برملا اعتراف کیا، واقعہ بھی یہ ہے کہ قائدِ اعظم نے اس پیام میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے،

رئیس احمد جعفری

میں آج رات ہو سکے تو اپنے نوجوانوں کے قلوب کے نئے نئے وجد آفریں تاروں کو چھیڑوں گا کیونکہ اب سے انہیں کو ہماری تمناؤں کا بوجھ اٹھانا ہے۔

رمضان المبارک کا ماہِ صوم و آج خداوند تعالیٰ کے حضور قلب کے لازوال عجز و انکسار کے ساتھ اختتام کو پہنچ رہا ہے، لیکن اسے کمزور قلب کا عجز و انکسار ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

وہ ایسا کریں گے تو وہ خدا اور رسول کے مجرم ہیں کیونکہ تمام مذاہب میں یہ ایک حقیقت موجود ہے جو اگرچہ بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتی، مگر ہے بالکل درست کہ عاجز و متواضع ہی قوی و طاقتور ہوں گے اور یہ حقیقت مذاہب اسلام میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے۔

قرآن حکیم کی رو سے عبادت اور زندگی میں بہت گہرا اور حقیقی تعلق ہے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے مذہب نے تمہیں انسانی برادری سے میل ملاپ رکھنے، ان کی تحقیق کرنے، انہیں سمجھنے اور جب سمجھ چکیں تو پھر ان کی خدمت کرنے کے کتنے عجیب مواقع عطا کیے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ یہ سارے مواقع آئین عبادت وضع کر کے پیدا کیے گئے ہیں۔

دن میں پانچ مرتبہ ہم کو اپنے محلّہ کی مسجد میں جمع ہونا پڑتا ہے "ہفتہ میں ایک مرتبہ جمعہ کے دن جامع مسجد میں ہمارا اجتماع ہوتا ہے"۔ پھر ہم سال میں ایک دفعہ عید کے دن شہر کے باہر عید گاہ میں اکٹھے ہوتے ہیں۔

اور سب سے آخر میں حج ہے۔ جہاں اطراف عالم سے مسلمان، کم از کم اپنی زندگی میں ایک مرتبہ خانۂ خدا سے رجوع ہونے کے لیے آتے ہیں۔ تم نے دیکھ لیا ہوگا کہ ہماری عبادت کی یہ ترتیب اور طریق عمل ہمیں لازماً نہ صرف مسلمانوں سے ربط رکھنے کا موقع دیتا ہے بلکہ دوران سفر دوسرے مذاہب کے لوگوں سے بھی تعلقات قائم کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ میں نہیں باور کرتا کہ ہماری عبادت سے متعلق یہ احکام محض ایک خوش گوار اتفاق ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی تشکیل اسی غرض سے کی گئی

ہے کہ مسلمانوں کی سماجی روح نمو پاتی اور تسکین حاصل کرتی رہے۔

کلام اللہ میں انسان کو خدا کا خلیفہ کہا گیا ہے۔ اگر انسان کی اس تعریف میں کچھ معقولیت ہے تو پھر ہم پر قرآن کی اتباع کا فرض عائد ہو جاتا ہے اور ہم پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں جیسا کہ خدا بنی نوع انسان کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ فرض وسیع معنوں میں "صرف محبت کرنے اور شاکر رہنے کا فرض ہے" یقین کیجیے کہ یہ فرض منفی نہیں بلکہ اثباتی ہے۔

ہمارے دلوں میں خلق اللہ کے لیے خواہ وہ کسی عقیدہ کے کیوں نہ ہوں۔ اگر کوئی محبت اور رواداری کا جذبہ ہے تو اس کا عملی اظہار ہمارے روزمرہ کے معمولی فرائض کے دوران میں ہونا چاہیے۔ سعادت مندی اور خدا ترسی سے ہونا چاہیے۔ صوم و صلوٰۃ کی ریاضت سے ہماری اندرونی کیفیات تابندہ ہو گئی ہیں اور اس ارادے سے بڑھ کر اور کوئی نیکی نہیں کہ آج ہم اپنے گھر میں اپنی قوم میں اور اپنے ملک میں ارتباط اور میل ملاپ سے رہیں اور ہم ایسے کام نہ کریں، خواہ وہ خانگی ہوں یا عامۃ الناس سے متعلق کہ جس کے نتائج خود غرضی پر مبنی ہوں بلکہ وہ اہل ملک کی فلاح و بہبود اور آخر میں ساری دنیائے انسانیت کی بھلائی کے لیے ہوں گے۔

یہ ایک بہت بلند تصور ہے، اور اس کے لیے بڑی کوشش اور قربانیوں کی ضرورت ہے۔ تمہارے دلوں پر لبسا اوقات خوف و وہم کے بادل چھا جائیں گے، نہ صرف مادی آویزشیں ہوں گی جس پر شاید تم ہمت و ارادے سے قابو پا سکو گے۔ بلکہ روحانی تصادم بھی ہوں گے۔ ہمیں ان سب کا مقابلہ کرنا ہے اور اگر آج جب کہ ہمارے قلوب عجز و انکسار کے جذبات سے مملو ہیں، ہم نے اس علو ہمتی کے اثر کو قبول نہ کیا تو پھر ہم کبھی بھی اس کے قابل نہ ہوں گے۔

ہمارے ہندو مسلم رہنما دونوں فرقہ وار تنازعات سے ملول ہیں، میں اس کے

اسباب اور وجوہات کی تاریخ میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن کچھ لمحات ایسے آئیں گے، جب کہ لوگوں کے دل مکدر ہوں گے اور اختلافات تصادم کی صورت اختیار کریں گے۔ میں تم سے کہوں گا کہ ایسے لمحات میں تم عید کی نمازوں کو یاد کر لیا کرو اور ان ہدایتوں کی روشنی میں جو قرآن حکیم نے تمہیں دی ہیں۔ اور اس جذبۂ عظیم کے تحت جو عین اسلام ہے، ذرا دیر کے لیے سوچو۔ یاد رکھو کہ ہمارے رسول پاک صلعم کے نزدیک خدمت خلق اور رواداری سے بڑھ کر کوئی طریق عمل دین دارانہ اور مستحسن نہیں ہے۔ ہماری سماجی کامرانیاں اور سیاسی آزادیاں اسی پر منحصر ہیں۔ یہی زندگی

کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی، کوئی حکومت ناانصافی اور جانب داری کی بنیادوں
پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اقلیت کے ساتھ ظلم و تشدد اس کی بقا کا ضامن نہیں ہو سکتا
اقلیتوں میں انصاف و آزادی، امن و مساوات کا احساس پیدا کرنا ہر انتخابی طرز حکومت
کی بہترین آزمائش ہے، اس خصوص میں ہم دنیا کے کسی متمدن ملک سے پیچھے نہیں
رہ سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ جب وقت آئے گا تو ہمارے ملکی خطوں کی اقلیتوں کو
ہماری روایات ثقافت اور اسلامی تعلیم سے نہ صرف انصاف و صداقت ملے گی
بلکہ انہیں ہماری کریم النفسی اور عالی ظرفی کا ثبوت بھی مل جائے گا، ہم مول تول نہیں
کرتے، ہم لمین دین کے عادی نہیں، ہم صرف عمل پہ یقین رکھتے ہیں اور صرف
تدبر اور عملی سیاست پر اعتماد رکھتے ہیں۔

لقدیر مدارس

(اپریل سنہ ۱۹۴۱ء)

"اسلام کی عالی حوصلگی اقلیتوں سے"

"اقلیتیں جہاں بھی ہوں ان کے تحفظ کا انتظام کیا جائے گا، میں نے ہمیشہ یقین کیا ——— اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا ایقان غلط نہیں ——— کوئی حکومت اور کوئی مملکت اپنی اقلیتوں کو اعتماد اور تحفظ کا یقین دلائے بغیر کامیابی

اصل مفہوم ہے اور یہی حقیقت نبری روحِ اسلام ملبہ میں اشکال گاہے ۔

ہندوستان میں مشترکہ قومیت کا تصور حد سے بہت دور نکل گیا ہے، اور اکثر و بیشتر مشکلات کا باعث بن رہا ہے اور بن چکا ہے۔ یہاں تک کہ اگر جلد ہی اس خیال کی اصلاح نہ کریں گے تو تباہ ہو جائیں گے۔ اور ہندو اور مسلمان مختلف مذہبی معتقدات، دو مختلف ادبیات اور دو مختلف النوع معاشرتی اطوار کے ماتحت ہیں۔

یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے۔ نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں اور یہ بھی اصرار کے ساتھ کہیے کہ وہ مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضدیں بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔

حیاتِ انسانی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی تمنائے ترقیات کے لیے مختلف تاریخوں سے شغف رکھتے ہیں۔ ان کے تاریخی وسائل اور ماخذ مختلف ہیں۔ دو قوموں کی رزمیہ نظمیں ان کے سربرآوردہ بزرگ اور قابلِ فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر اوقات ایک

حاصل ہو۔ ایسی ریاست کے آئین کا نقش خاکہ یہی ہوا کرے گا۔

تقریر لاہور

مارچ ۱۹۴۰ء

دو سال پہلے میں نے شملہ میں کہہ دیا تھا کہ جمہوری پارلیمانی طرز کی حکومت ہندوستان

کے لیے ناموزوں ہے مجھ سے کہا گیا کہ میں نے تعلیماتِ اسلامی کو ضرر پہنچانے کا

جرم کیا ہے کیونکہ اسلام جمہوریت پسند ہے۔

جہاں تک میں نے اسلام کو سمجھا ہے وہ کسی ایسی جمہوریت کی تلقین نہیں کرتا

جس کی بناء پر مسلمانوں کی قسمت کے فیصلوں کا اختیار غیر مسلم اکثریت کے ہاتھ میں

چلا جائے۔ ہم کسی ایسی طرزِ حکومت کو قبول نہیں کر سکتے کہ جس میں غیر مسلم محض عددی

اکثریت کی وجہ سے ہم پر قبضہ و اقتدار حاصل کر کے حکومت کر سکتے ہوں۔ مجھ سے یہ

سوال کیا گیا کہ اگر میں جمہوریت نہیں چاہتا تو پھر کیا چاہتا ہوں ——————

فاسطیّت، نازیت، یا آمریت ؟ میں کہتا ہوں ان ہتھکنڈوں اور جمہوریت

کے پرستاروں نے کیا کیا ہے؟ انھوں نے چھ کروڑ انسانوں کو تو اچھوت بنا رکھا

ہے اور ایسے اصول گھڑے گئے ہیں جو فاسطی مجلسِ اعلیٰ کے سوائے اور کچھ نہیں

ہیں۔ ان کا آمر کانگریس کا چار آنہ کا رکن بھی نہیں ہے۔ انھوں نے ایسی کٹھ پتلی وزارتیں

بنائی ہیں جو مجلسِ قانون ساز یا رائے دہندگان کو نہیں بلکہ مسٹر گاندھی کے سامنے

جواب دہ ہیں۔

ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر انگلستان اور فرانس کو شکست ہوگئی تو ہندوستان
کی آزادی کا کیا فائدہ؟

تقریر علی گڑھ

۶ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب اور
فنِ لطیف و فنِ تعمیر، نام و نسب، شعورِ اقدار و تناسب، قانون و اخلاق، رسم و رواج
تاریخ و روایات اور رجحان و مقاصد، ہر ایک لحاظ سے ہمارا اپنا انفرادی زاویہ نگاہ اور
زاویہ نگاہ ہے اور جدا فلسفۂ حیات ہے، بین الاقوامی قانون کی ہر تعریف ہماری قومیت
کو سلامی دینے کے لیے تیار ہے۔

ایسوسی ایٹڈ پریس - امریکہ

یکم جولائی ۱۹۴۲ء

انہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا، سنیے قائداعظم کیا فرماتے ہیں؟

○

بنگال میں کانگریس پارٹی کیا کر رہی ہے؟ مسٹر حق صاحب نے جو نئی وزارت مرتب کی ہے۔ کانگریس پارٹی اس کی حمایت کر رہی ہے۔ اور اسی حمایت کی وجہ سے وہ ..... وزارت قائم کر سکتے ہیں انہیں شریک کر چکنے کے باعث لارڈ لن لتھگو صاحب یہ اعلان کر سکے کہ:۔

"اب مجھے اس جلیل القدر وزیر اعظم کی تائید حاصل ہو گی"

وزیر اعظم بنگال اپنے عہدہ کے باعث نام نہاد نیشنل ڈیفنس کونسل کے رکن بھی ہوں گے۔ کانگریس ان ..... کی حمایت کر رہی ہے۔

میں ان ..... کو کرسمس کے تحفہ پر لارڈ لن لتھگو کی خدمت میں پیش کرتا ہوں (تالیاں) اور گورنر بنگال کی خدمت میں نواب ڈھاکہ

مغرب کے مختلف ممالک میں بھی عام طور پر مختلف نوع کی جمہوریت ہوتی ہے۔
چنانچہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان میں جہاں کے حالات یورپ سے
مختلف ہیں۔ برطانی جماعتی طرزِ حکومت اور نام نہاد جمہوریت قطعی ناموزوں ہے۔
اب صورتِ حال کیا ہے؟ آپ کو یاد ہوگا کہ جب جنگ چھڑی تھی تو مسٹر گاندھی

کو ہدیۂ پیش کرتا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ مسلم ہندوستان کو ان لوگوں سے نجات ملی جو مسلمانوں کے ساتھ بدترین غداری اور دغابازی کے مجرم ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی انجمن میں غداروں کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی بڑے آدمی ہوں ان کو نکال دینا چاہیے۔ اب ہم آبرومندانہ طور سے بڑھیں گے۔ اور ان غدار قسم کے لوگوں کو خارج کر کے زیادہ طاقت حاصل کر سکیں گے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمیں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے سے نہیں روک سکتی۔!

کیا اب بھی مولانا اپنے الفاظ واپس نہ لیں گے؟

حلف نامہ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ؕ

قل اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِین ؕ

کہہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کیلیے ہے۔

○

میں .... رکن مسلم لیگ پارٹی صوبائی لیجسلیٹو اسمبلی/کونسل

صوبہ .... اپنے اس پختہ عقیدہ کا اعلان کرتا ہوں کہ برِّ کوچک

ہند میں بسنے والی مسلم قوم کی نجات، اس کی سلامتی، اس کا تحفظ اور اس کا مستقبل

حصولِ پاکستان میں مضمر ہے اور پاکستان ہی اس وسیع برِّ کوچک کے پیچیدہ دستوری

مسائل کا حل .... باوقار اور معقول حل ہے اور اسی کے ذریعہ

یہاں بسنے والی تمام قوموں اور فرقوں کو امن آزادی اور خوش حالی ہو سکتی ہے۔

میں بہ صمیمِ قلب اقرار کرتا ہوں کہ اس مقصد عزیز یعنی پاکستان کو حاصل کرنے

کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے جو تحریک بھی روبہ عمل لائی جائے گی اور

اس سلسلہ میں ہدایات و احکام جاری کیے جائیں گے۔ میں بلا لیس و پیش کمال رضا

مندی کے ساتھ ان کی پوری پوری تعمیل کروں گا اور اس امر کا یقین کامل رکھتے ہوئے

حلف نامہ

(جس پر قائداعظم نے بھی دستخط کیے)

۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء

انگریز دل اور کانگریس کی سازش نے جب بظاہر یہ امکان پیدا کر دیا تھا کہ پاکستان نہیں بننے دیا جائے گا تو قائداعظم نے مرکزی اسمبلی اور تمام صوبائی مجلس آئین ساز کے مسلم ممبروں کا ایک کنونشن دہلی میں طلب کیا، اور ایک مرتبہ پھر مطالبۂ پاکستان کا اعادہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ سب نے ایک حلف نامے پر دستخط بھی کیے۔

یہ حلف نامہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

کہ میرا مقصد و مدّعا حق و انصاف پر مبنی ہے۔ میں عہد کرتا ہوں کہ اس راہ میں جو خطرات اور آزمائشیں پیش آئیں گی اور جن قربانیوں کا مطالبہ ہوگا انہیں برداشت کروں گا۔

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ

اے پروردگار! ہمیں صبر و استقامت دے۔ ہمیں ثابت قدم رکھ اور قومِ کفار پر ہمیں فتح و نصرت عطا فرما۔

دستخط.....

مؤرخہ .....

کیا یہ حلف نامہ قائدِ اعظم کے جذبہ ایمانی اور حبِ اسلام کی واضح دلیل نہیں ہے؟

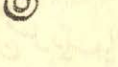

ہم سچے مسلمان ہیں

اگر آپ حقیقت ہیں پاکستان چاہتے ہیں تو میں خداوند کریم سے دعا کرتا ہوں کہ مسلمان کے دامن پر وہ بدنما داغ نہ لگے، جس کا مظاہرہ مظلوم مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کر کے بہار میں کیا گیا ہے۔ ہمیں تہذیب و شرافت کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں، ان سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے۔ مگر ہم مسلم اکثریت والے صوبوں میں بے گناہوں کو مار کر اپنا دل ٹھنڈا نہ کریں گے۔ ہم کو سیاسی طور سے بتا دینا چاہیے کہ ہم بہادر اپنے دشمنوں کو معاف کر دینے والے ایمان دار اور سچے مسلمان ہیں۔ پاکستان میں غیر مسلم اپنی جان و مال اور عزت کی حفاظت خود مسلمانوں سے بڑھ کر پائیں گے۔ اگر مسلمانوں نے دامن صبر و رضا کو ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اپنے توازن کھو دیا اور اسلام نے جو عدیم المثال سبق دنیا کو سکھایا ہے اسے بھلا دیا تو سمجھ لیجیے کہ آپ نہ صرف اپنے حق پاکستان کو کھو دیں گے بلکہ ہندوستان میں وہ کشت و خون ہوگا، جس سے ہماری آزادی کے دن دور ہٹ جائیں گے۔ اور ہم اپنی غلامی کی بیڑیاں اپنے ہی ہاتھوں سے مضبوط کریں گے۔

مجھے خوشی ہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں امن و امان ہے اور وہ اس ظلم و فساد اور کشت و خون میں شامل نہیں ہیں جس کا مظاہرہ باقی تمام ہندوستان میں ہو رہا ہے۔

میں ایک بار پھر ان تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جہاں بھی اکثریت میں ہوں۔ غیر مسلموں کی حفاظت جان و مال کے لیے جو کچھ بھی ممکن ہو کریں۔ اور ان میں بھروسہ پیدا کریں لے

اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ہیں، جو بے گناہ مسلمان شہید کیے گئے ہیں۔ یا زخمی ہو گئے ہیں یا مال و اسباب لوٹا گیا ہے ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی وہ یہ سمجھ لیں کہ انہوں نے جنگِ پاکستان اور آزادی کے لیے اپنا حق ادا کر دیا ہے لے

لے اس اپیل پر مسلمانوں نے امکانی حد تک پوری صداقت اور سچائی سے عمل کیا۔

لے اقلیت والے صوبوں کے مسلمانوں نے یہی سمجھ کر کہ اس قتل و غارت اور کشت و خون کی صورت میں ان سے پاکستان کی قیمت طلب کی جا رہی ہے، یہ مظالم ایسی استقامت و عزیمت سے برداشت کیے، جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی!"

تقریر ۲۱ نومبر ۱۹۴۶ء

پاکستان اور عالمِ اسلام

اگر ہندو شہنشاہیت قائم ہوگئی تو تمام مسلمان ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے۔ اور بالکل اسی طرح برطانی ملوکیت کے غلام ہو جائیں گے۔ ہمارے لیے پاکستان زندگی اور موت کے سوال کی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے گھروں میں آزاد ہیں تو آپ کو ہمارے ساتھ اشتراک عمل کرنا چاہیے، قائداعظم نے اعلان کیا کہ اس وقت کوئی بھی ایسی مسلم حکومت موجود نہیں ہے جو صحیح معنی میں آزاد ہو۔ ایران جو کئی صدیوں سے آزاد تھا، غلام ہو گیا، اس وقت تک مسلمان اور عرب حکومتیں حقیقی معنوں میں آزاد نہ ہوں گی۔ جب تک پاکستان قائم نہ ہوگا۔ اس لیے جو شخص ہندوستان پر اقتدار رکھتا ہے وہی مشرق وسطیٰ پر اقتدار رکھتا ہے، آپ نے ضیافت کے شرکاء سے کہا کہ اگر ہندوستان میں ہندو شہنشاہیت قائم ہوگئی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان سے اسلام ختم ہوگیا، بلکہ ہندوستان ہی سے نہیں، دوسرے اسلامی ملکوں سے بھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مذہبی اور روحانی رشتے ہمیں اور مصریوں کو ایک رشتہ میں باندھے ہوئے ہے۔ اگر ہم ڈوبے تو سب ڈوب جائیں گے۔

اپنے دورے کا مقصد بتاتے ہوئے قائداعظم نے کہا کہ میں یہاں عرب لیگ

کا مہمان ہوں میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ مصر کی سیاسی حالت کا مطالعہ قریب سے کر سکوں، مجھے اس بات کی فکر ہے کہ اہلِ مصر یہ سمجھیں کہ مسلم ہندوستان کس مقصد کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اور یہ بات مصر کے لیے کتنی اہم ہے کہ ہم مسلمانانِ ہند حصولِ پاکستان میں کامیاب ہوں اور یہ بات اہلِ مصر کے لیے کتنی خطرناک ہوگی، اگر ہم اس مقصد میں کامیاب نہ ہوں گے۔ قائدِ اعظم نے انکشاف کیا کہ جب لندن جا رہا تھا تو مصر سے گذرتے ہوئے میرے اوپر یہ بات منکشف ہوئی کہ کانگریسی ایجنٹوں نے کتنا وسیع پروپیگنڈا مصر میں کر رکھا ہے۔ میں نے بہت کم سنا اور دیکھا، لیکن اس مختصر سے تجربے سے ہی میں نے یہ بات محسوس کر لی کہ کانگریسی ایجنٹوں نے مصریوں کو ہندوستان کے حالات اور حقائق کی بابت کس حد تک گمراہ کر رکھا ہے۔ میں ہر اس مصری سے جو اپنے ملک اور ہندوستانی مسلمانوں کی محبت اپنے دل میں رکھتا ہے، یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے سوالات پر گہری نظر سے غور کرے۔ اس کے بعد مصری یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ ہندو راج کا خطرہ کتنا قوی ہے۔ جو اپنے نیچے مشرقِ وسطیٰ تک پھیلنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اگر ہم حصولِ پاکستان میں کامیاب نہ ہو سکے۔

تقریر (قاہرہ)

۲۰ دسمبر ۱۹۴۶ء۔

ہمارے رسُول کا اسوۂ حسنہ

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائدِ اعظم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ پاکستانی اقلیتوں کے ساتھ وہ سلوک کریں جو شہنشاہ اکبر نے کیا تھا، قائدِ اعظم کا جواب باصواب :-

"شہنشاہِ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جو خیر سگالی اور رواداری کا برتاؤ کیا وہ کوئی نئی بات نہ تھی - اس کی ابتدا آج سے تیرہ سو برس پہلے ہی ہمارے رسولؐ نے کر دی تھی - انھوں نے زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی یہود و نصاریٰ پر فتح حاصل کرنے کے بعد نہایت اچھا سلوک کیا - ان کے ساتھ رواداری برتی اور ان کے عقائد کا احترام کیا - مسلمان جہاں کہیں بھی حکمراں رہے - ایسے ہی رہے - ان کی تاریخ دیکھی جائے تو وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور عظیم المرتبت اصولوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہو گی - جن کی تقلید ہم سب کو کرنی چاہیے -

مجلسِ دستور ساز میں ۱۴ اگست کو ۱۹۴۷ء کو

لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کے جواب میں

کیا یہ الفاظ ایک مومن قانت کے سوا کسی اور کی زبان سے بھی نکل سکتے تھے ؟

پاکستان میں اسلام کی حکومت ہوگی

"قیام پاکستان جس کے لیے ہم گذشتہ دس سال سے جدوجہد کر رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اپنے لیے ایک مملکت قائم کرنا یہی ہمارا مقصود نہیں تھا، بلکہ یہ ذریعہ تھا حصولِ مقصود کا۔ خیال یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کے مالک ہوں جہاں ہم اپنی روایات اور تمدنی خصوصیات کے مطابق ترقی کر سکیں۔ جہاں اسلام کے عدل و مساوات کے اصولوں کو آزادی سے بر سرِ عمل آنے کا موقع حاصل ہو"

افسرانِ حکومت سے خطاب

۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء

◎

ہم اسلامی جمہوریت قائم کرینگے

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے۔ جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلامؐ نے ہمارے لیے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح معنوں میں اسلامی تصوّرات اور اصولوں پر رکھیں۔

شاہی دربار سبّی

بلوچستان میں تقریر

۱۴ فروری ۱۹۴۸ء

ہم اسلامی جمہوریت کی پاسبانی کریں گے

ہم نے پاکستانی کی جنگ آزادی جیت لی ہے۔ مگر اسے برقرار رکھنے اور مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کی سنگین ترین اور بے حد مشکل جنگ ابھی جاری ہے۔ اور اگر ہمیں ایک بڑی قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ فطرت کا اٹل اور سفاک قانون ہے۔ "بقائے اصلح" ہمیں خود کو اس نئی آزادی کا اہل ثابت کرنا ہے۔ فحاشت کے خطرات سے دنیا کو بچانے، اور جمہوریت کے لیے محفوظ بنانے کی خاطر کرۂ ارض کے دور دراز حصوں میں جا کر آپ نے میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت حاصل کی ہے۔ مگر اب آپ کو اپنے ہی وطنِ عزیز کی سرزمین پر اسلامی جمہوریت،

اسلامی معاشرہ عدل اور مساواتِ انسانی کے اصولوں کی پاسبانی کرنی ہے۔ آپ کو ان کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑے گا۔ ہمہ تن ہوشیار رہنے کا موقع ابھی نہیں آیا ہے۔ یقین محکم، ضبط و نظم، اور ادائیگی فرض کی دھن۔ ایسے اصول ہیں کہ اگر آپ ان پر کاربند رہے تو کوئی شے ایسی نہیں جسے آپ حاصل نہ کر سکیں۔

افواجِ پاکستان کے سامنے

۲۱ فروری ۱۹۴۸ء

اسلامی سوشلزم

جب آپ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی بنیاد عمرانی عدل اور اسلامی سوشلزم کے اصولوں پر رکھی جائے تو بنی نوع انسان کی اخوت اور مساوات پر زبردست زور دیتے ہیں تو آپ محض میرے اور لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور اسی طرح جب آپ ہر شخص کے لیے مساوی مواقع مانگتے ہیں تب بھی آپ میرے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ترقی کے ان مقاصد کے متعلق پاکستان میں کوئی اختلاف رائے نہیں۔ کیونکہ ہم نے پاکستان اس لیے طلب کیا تھا اس کی خاطر جدوجہد کی تھی اور اسے اس لیے حاصل کیا تھا کہ ہم اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کو حل کرنے میں جسمانی اور روحانی طور پر قطعاً آزاد ہوں۔ اخوت، مساوات اور رواداری یہ ہیں ہماری مذہب، تہذیب اور تمدن کے اساسی لفظے۔ ہم نے پاکستان کے لیے اس واسطے جنگ کی تھی کہ اس برعظیم میں ہمیں ان انسانی حقوق سے محروم کر دیے جانے کا خدشہ تھا۔

تقریر چاٹگام

۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء

ختم شد